دوسری بیوی

آٹھواں مجموعہ

جرائم اور سراغرسانی کی چار سچّی کہانیاں

احمد یار خان

جملہ حقوق بحق تخلیقات محفوظ ہیں

ناشر : "تخلیقات" لاہور
اہتمام : لیاقت علی
پرنٹرز : اجالا پرنٹرز' لاہور
ڈیزائن : ریاظ
سن اشاعت : فروری 2000ء

قیمت : 60 روپے

فہرست

بیٹی کی قربانی ۵
اور وہ پاگل ہوگئی ۷۳
دوسری بیوی ۱۲۷
بہن کے سہاگ کے لیے ۱۶۹

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی کہانیوں کا آٹھواں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

احمد یار خان مزید تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ ان کا نام سراغرسانی اور تفتیش میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے متعلق بھی اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ان کہانیوں نے بے شمار قارئین کو جرم و جاسوسی کی ترجمہ شدہ کہانیوں سے ہٹا دیا ہے۔ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی جرم و جاسوسی کی کہانیاں تو ایک نشے کی طرح قارئین پر طاری تھیں۔ محترم احمد یار خان نے انہیں اس نشے سے نجات دلا دی ہے۔

مکتبہ داستان لمٹیڈ کی اس کاوش کو قارئین نے پسند کیا ہوگا کہ ہم نے جتنی بھی کتابیں پیش کی ہیں، ان میں اپنے معاشرے، اپنے مسائل اور اپنے احوال و کوائف کو پیش کیا ہے اور حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ کہانیاں چار دیواری کی دنیا کی ہوں، مقناطیسی شخصیت کے مضامین ہوں، شکار کے قصے ہوں یا کوئی سی بھی کتاب ہو، ہم اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کو آپ جانتے پہچانتے ہیں۔ آپ کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ آپ خود ان کہانیوں کے کردار بن جاتے ہیں۔

ہم نے عشق و محبت کے افسانوں اور ناولوں سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ اگر ہم ناول پیش کریں گے تو اس میں بھی قومی روح کو نہیں بھولیں گے۔ مثلاً "طاہرہ" اور اسی ناول کا دوسرا حصہ "خاکی وردی لال لہو"۔ ان میں آپ کو ماضی قریب کی تاریخ ملے گی جو آپ کو نیا ولولہ دے گی۔

جن ناولوں کو ہم تاریخی ناول کہتے ہیں، مثلاً "داستان ایمان فروشوں کی"، "اُندلس کی ناگن" وغیرہ، ان میں آپ کو ناول کی چاشنی اور دلچسپی تو ملے گی لیکن تاریخ کے واقعات کو صحیح شکل و صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

فحش اور مار دھاڑ کی کہانیوں کی مقبولیت کو کم کرنے کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی صاف ستھری کہانیاں قارئین کو دی جائیں جن میں کہانی والا تفریحی عنصر بھی ہو اور ان میں پڑھنے والے کے ایمان کو تازہ اور جذبے کو زندہ کرنے کا سامان بھی ہو۔ مکتبہ داستان اپنے اس تجربے میں کامیاب ہے۔

اپنے بچوں کو آپ کہانیاں پڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ اگر آپ انہیں ایسی کہانیوں سے بچانا چاہتے ہیں جن میں تفریحی اور ذہنی عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا تو انہیں ہماری کتابیں پڑھائیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

بیٹی کی قربانی

میں دیہاتی علاقوں کی وارداتوں کی تفتیش کا عادی ہوگیا تھا یا قصبوں میں معمولی معمولی گھرانوں کے ملزموں سے واسطہ پڑا۔ ان علاقوں میں مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور ان کی فطرت اور عادات کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کیونکہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں۔ دیہاتی علاقہ راولپنڈی ضلع کا ہو یا وسطی ہندوستان کا، وہاں کے رہنے والوں کی فطرت اور معاشرتی قواعد و ضوابط ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پولیس سے ڈرتے بھی تھے جس سے تفتیش میں خاصی مدد مل جاتی تھی مگر دلی میں مجھے ایسی سوسائٹی میں دوہرے قتل کی تفتیش کے لئے بھیج دیا گیا جو میرے لئے اجنبی اور عجیب سی تھی۔

یہ تھی اینگلو انڈین سوسائٹی، اور وہ بھی دلّی کی جو انگریزی راج کا دارالحکومت تھا۔ یہ واقعہ بہت پرانا ہے جب انگریزوں نے کبھی

سوچا بھی نہ ہوگا کہ ہندوستان سے اُن کا بوریا بستر گول ہو سکتا ہے۔ کہانی سُنانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اینگلو انڈین سوسائٹی کے متعلق کچھ بتا دوں۔ پاکستان میں بھی اینگلو پاکستانی آباد ہیں اور یہاں شہروں میں پاکستانی عیسائی بھی ہمارے ساتھ رہتے سہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں صرف مذہب کا فرق ہے۔ ویسے وہ ہماری ہی طرح ہیں۔ وہ پاکستان کو ہی اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ ہمارے گھریلو اور اجتماعی دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اور مسلمان انہیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میں جب اینگلو انڈین کے متعلق بات کروں تو یہ نہ سمجھئے گا کہ اس میں اینگلو پاکستانی بھی شامل ہیں۔

انگریزوں نے جب ہندوستان میں اپنی حکومت مضبوط کر لی تو وہ ہندوستانیوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ اُنہوں نے اپنے مذہب کو بہت فروغ دیا۔ بعض انگریزوں نے خوبصورت ہندوستانی لڑکیوں کو عیسائی بنا کر ان سے شادیاں کر لیں اور بعض انگریز عورتوں نے ہندوستانی مردوں سے شادیاں کر کے انہیں عیسائی بنا لیا۔ ان کی اولاد گورے رنگ کی تھی۔ یہ لوگ اینگلو انڈین کہلاتے۔ یہ اولاد جوان ہوتی تو اپنے آپ کو پورا انگریز اور ہندوستان کا بادشاہ سمجھنے لگی۔ یہ نسل ہندوستانیوں سے اُسی طرح نفرت کرنے لگی جس طرح انگریز کرتے تھے لیکن اس کی فطرت میں ہندوستانی پن موجود تھا۔

انگریزوں کا رویّہ ان کے حق میں اچھا نہیں تھا۔ برطانیہ کی سوسائٹی انہیں ہندوستانی ہی کہتی تھی۔ وہاں اور ہندوستان میں بھی انگریز سوسائٹی نے ان انگریز مردوں اور عورتوں کو پسند نہ کیا جنہوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ شادی کی تھی، اور کرتے تھے۔ اس طرح یہ صورت پیدا ہو گئی کہ اینگلو انڈین تو ہندوستانیوں سے دُور رہتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہندوستانیوں کا بادشاہ سمجھتے تھے اور دوسری طرف انگریز اینگلو انڈین کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے کیونکہ انگریز انہیں ہندوستانی سمجھتے تھے۔ مگر اینگلو انڈین انگریزوں کے ساتھ ہی اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کی لڑکیوں کے رنگ گورے اور نقش اچھے ہوتے تھے اس لئے ان لڑکیوں کو انگریز سوسائٹی میں مقبولیت حاصل تھی۔ ان دیسی میموں کی بدولت ان کے خاوندوں، بھائیوں اور باپوں کو انگریز سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ البتہ انگریزوں نے ترقی اور عہدوں میں انہیں ہندوستانیوں پر ہمیشہ ترجیح دی۔ ان میں ایسے گھرانے بھی تھے جنہوں نے اپنی خاندانی عزت اور وقار کو سنبھالے رکھا۔

اُس پُرانے دَور کے اینگلو انڈین انگریزوں کی طرح رہتے سہتے تھے۔ ان کی کوٹھیاں، بنگلے اور کوارٹر عام ہندوستانیوں سے الگ تھلگ ہوتے تھے۔ وہ شراب پیتے، مغربی ناچ ناچتے اور ہر لحاظ سے انگریزوں کی نقل کرتے تھے۔ عام طور پر ان کی اخلاقی حالت

قابلِ تعریف نہیں تھی۔

واقعہ یوں ہُوا کہ ایک اینگلو انڈین مرد، رابرٹ اور ایک اینگلو انڈین عورت مسز فرانسس کو کسی نے اکٹھے قتل کر دیا۔ دونوں مسز فرانسس کے بیڈ رُوم (سونے کے کمرے) میں رات کو قتل ہُوئے تھے۔ مسز فرانسس کا خاوند فرانسس سرکاری دَورے پر دلّی سے باہر گیا ہُوا تھا۔ متعلقہ تھانہ تفتیش کر رہا تھا۔ رابرٹ اور فرانسس مرکزی حکومت میں افسر تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی تھیں جن کی بنا پر یہ تفتیش تھانے سے لے کر ایک انگریز پولیس انسپکٹر ایل۔ بی۔ ڈوبگن کے سپرد کر دی گئی اور اس کے ساتھ مجھے لگا دیا گیا۔ مجھ میں خرابی یا خوبی یہ تھی کہ میں انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اُس دَور میں انگریزی زبان عام نہیں ہُوئی تھی۔ اس طرح یہ تفتیش سی۔ آئی۔ اے کے سپرد ہُوئی۔ واردات کو کم و بیش بیس روز گزر گئے تھے۔

ڈوبگن بڑا ہی تیز طرّار اور غیر معمولی قابلیت کا پولیس انسپکٹر تھا۔ اردو روانی سے بولتا تھا۔ ہندوستانی ذہنیت، فطرت اور نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ڈیوٹی اور ڈسپلن کا سخت پابند، قانون کا احترام مذہب کے احترام کی حد تک کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ انگریز پولیس افسروں جیسی خوبیاں پاکستان کے پولیس افسروں میں پیدا ہو جائیں یا ہونے دی جائیں تو یہاں جرائم کی یہ بھرمار نہ

رہے اور لوگ امن اور چین کی نیند سوئیں۔

ہم نے تھانے کے انچارج سے واردات کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُس نے جو کاغذات تیار کئے تھے اور جو برآمدگیاں کی تھیں، وہ لیں۔ ہم نے دیکھا کہ بیس دنوں میں اُس نے اتنا کام نہیں کیا تھا جتنا بیس دنوں میں ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے یہ عُذر پیش کیا کہ مقتولہ کا خاوند، فرانسس، تعاون نہیں کرتا۔ فرانسس خوش تھا کہ اُس کی بیوی قتل ہو گئی ہے۔ ڈوبگن نے یہ عُذر قبول نہ کیا۔ اس سب انسپکٹر کا نام جگ موہن سنگھ تھا۔ وہ ہندو راجپوت تھا۔ راجپوتی اور تھانیداری کے رُعب میں رہتا اور کام کم کرتا تھا۔

قتل کی واردات اس طرح ہُوئی کہ فرانسس نام کا ایک اینگلو انڈین جس کی عمر چالیس سال سے کچھ اُوپر تھی، سرکاری بنگلہ نما کوارٹر میں رہتا تھا۔ وہ سرکاری دَورے پر گیا ہُوا تھا۔ گھر میں اُس کی بیوی رہ گئی تھی۔ فرانسس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ یہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ اُس کی عمر، قتل کے وقت پچیس چھبیس سال تھی۔ پہلی بیوی مر گئی تھی۔ اُس سے بھی کوئی بچہ نہ تھا۔ دوسری شادی کو دو سال گزر گئے تھے۔ فرانسس دَورے پر گیا تو گھر میں بیوی اکیلی تھی۔ نوکر صرف خانساماں تھا۔ اسی کی بیوی گھر میں جھاڑ پونچھ اور چھوٹے موٹے کام کرتی تھی۔ یہ میاں بیوی رات کو کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلے جاتے تھے۔

فرانسس جس روز دَورے پر گیا، اس سے اگلی صبح خانساماں

نے مسز فرانسس کے لئے بیڈ ٹی تیار کی۔ بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ خانساماں نے اُس صبح یہ دیکھا کہ مسز فرانسس جو صبح سویرے سے جاگنے کی عادی تھی، ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ خانساماں اس خیال سے انتظار کرتا رہا کہ صاحب دَورے پر چلے گئے ہیں اس لئے میم صاحب ذرا دیر سے اُٹھے گی۔ اُس نے پندرہ منٹ بعد ذرا زور سے دستک دی۔ اب بھی اندر خاموشی تھی۔ اُس نے نصف گھنٹہ بعد تازہ چائے تیار کی کیونکہ پہلی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اب کے بھی اسے دستک کا جواب نہ ملا۔ بیڈ روم کے اندر جھانکنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

خانساماں باورچی خانے میں چلا گیا۔ سورج نکل آیا۔ مسز فرانسس اتنی دیر تک کبھی نہیں سوئی تھی۔ اتنے میں خانساماں کی بیوی اپنا کام کرنے کے لئے آئی۔ وہ بھی حیران ہوئی کہ میم صاحب ابھی تک نہیں جاگی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں بنگلے کے پچھلے برآمدے میں سے گزری تو فرش پر اُسے لال رنگ کے دھبّے نظر آئے۔ اس رنگ پر چیونٹیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ یہ دراصل جوتیوں کے نشان تھے۔ رنگ جوتیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ برآمدے میں اسی جگہ ایک کمرے کی کھڑکی تھی جس میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ چٹخنی اُوپر یا نیچے کی بجائے درمیان میں تھی۔ وہیں سے ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا مگر سب انسپکٹر ہنگ موہن کے بیان کے مطابق، اُس نے جب اس جگہ کا معائنہ کیا

تو اُسے شیشے کے ٹکڑے نہیں ملے تھے جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ شیشہ توڑا نہیں گیا، پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

خانساماں سے جب ہم نے پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ اُسے معلوم نہیں کہ یہ شیشہ کب اور کیسے ٹوٹا تھا۔ البتہ اُس کی بیوی نے بتایا کہ پہلے کا ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ ہر روز جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ اندر کی طرف کھڑکی کے ساتھ پردہ لٹکا ہوا تھا۔

یہ کمرہ فرانسس کا گھریلو دفتر یا سٹڈی روم تھا۔ اس کے اور بیڈ روم کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ خانساماں کی بیوی نے دیکھا کہ کھڑکی کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا ہوا ہے۔ یہ کھڑکی بند رہتی تھی۔ یہ عورت اتنی عقلمند نہیں تھی کہ اسے کچھ شک ہوتا۔ وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب خانساماں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میم صاحب بیمار ہو گی۔ بیڈ روم کے دروازے کے اندر کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ خانساماں کی بیوی نے اُسے بتایا کہ پچھلے برآمدے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ خانساماں نے بیوی سے کہا کہ میم صاحب اکیلی ہے۔ تم اس کھڑکی سے اندر جاؤ اور بیڈ روم میں جھانک کر دیکھو۔ دونوں میاں بیوی اُدھر چلے گئے۔

خانساماں نے برآمدے کے فرش پر لال نشان دیکھے تو اُسے کچھ شک ہوا۔ برآمدے سے دس بارہ قدم دُور گز ڈیڑھ گز اُونچی دیوار تھی جو بنگلے کے چاروں طرف تھی۔ یہ دس بارہ قدم جگہ پھولوں کی

کیاریاں تھیں۔ خانساماں کو شک ہُوا کہ برآمدے میں جوتیوں کے نشان ہیں۔ اُس نے دو کیاریوں کے درمیان کچی مٹی پر بھی نشان دیکھے۔ وہاں ان کے ساتھ لال نشان نہیں تھے۔ خانساماں نے اپنی بیوی کو نہ بتایا کہ اُسے کچھ شک ہے۔ اُس نے کھڑکی کا کواڑ کھولا اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اندر چلی جائے۔ وہ خود اس لئے نہ گیا کہ ہو سکتا ہے مسز فرانسس کیسے لباس میں ہو۔ عورت عورت کو کسی بھی حالت میں دیکھ لے کوئی ہرج نہیں ہوتا۔

اُس کی بیوی کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔ سٹڈی رُوم اور بیڈ رُوم کے درمیان والا دروازہ کھلا تھا۔ خانساماں کی بیوی دبے دبے پاؤں اُدھر گئی۔ دو تین بار اُس نے پکارا ——"میم صاحب ... میم صاحب" —— اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دروازے میں رُکی اور بیڈ روم میں دیکھا۔ اچانک اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ کھڑکی کی طرف دوڑی۔ خانساماں کھڑکی میں سے کُود کر اندر چلا گیا اور بیڈ روم میں جا پہنچا۔ اُسے چکر آ گیا۔

چھوٹے سے بیڈ روم کے فرش پر خُون کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس خون میں ایک آدمی اوندھے مُنہ پڑا تھا اور وہ نیم برہنہ تھا۔ اُس کے جسم پر صرف قمیض تھی جو خُون سے لال تھی۔ کمرے میں ڈبل بیڈ تھا۔ جس طرف یہ آدمی پڑا تھا اُسی طرف مسز فرانسس یوں پڑی تھی کہ اُس کا سر، کندھے اور پیٹھ فرش پر تھے اور ٹانگیں پلنگ پر۔ پلنگ پوش

بھی خون سے لال تھا۔ مسز فرانسس بھی نیم برہنہ تھی۔ اُس کا پیٹ پھٹا ہُوا تھا اور انتڑیاں وغیرہ باہر آ کر جسم پر بکھری ہوئی تھیں۔ اُس کا مُنہ چونکہ اوپر کو تھا اس لئے پیٹ کی بیشتر آلائش اور خُون اُس کے چہرے اور سر کو ڈھانپے ہُوئے تھا۔ ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔

خانساماں کو معلوم تھا کہ مسز فرانسس اکیلی ہے مگر وہاں ایک اور آدمی تھا۔ اُسے خانساماں پہچان نہ سکا کیونکہ وہ اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ یہ کوئی غیر آدمی تھا۔ فرانسس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو دَورے پر گیا ہُوا تھا۔ خانساماں کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی کے راستے باہر آیا تو ساتھ کے بنگلے میں رہنے والوں کو بتایا۔ وہاں زیادہ تر اینگلو انڈین رہتے تھے۔ کئی مرد اور عورتیں آ گئیں۔ مرد کھڑکی میں سے اندر گئے اور دیکھ کر واپس آ گئے۔ اُنہوں نے لاشوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ خانساماں کو ساتھ لے کر پولیس سٹیشن چلے گئے اور جگموہن سنگھ آ گیا۔ اُس نے موقعۂ واردات پر جو کاغذی اور دیگر کارروائی کرنی تھی، کی اور لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیں۔

دوسرا آدمی جو مسز فرانسس کے ساتھ قتل ہُوا تھا، پہچان لیا گیا۔ وہ رابرٹ تھا جو شہر کے کسی اور حصّے میں رہتا تھا۔ جگموہن سنگھ تفتیش میں کوئی کمال نہ دکھا سکا۔ فرانسس کو اُسی روز تار دے دیا گیا اور وہ رات کو آ گیا تھا۔ اُس نے جگموہن سنگھ سے کہا کہ اُس کی بیوی نے اُسے دھوکہ دیا ہے، اس لئے اُسے کوئی افسوس نہیں

کر وہ قتل ہو گئی ہے۔ رابرٹ کے متعلق اُس نے کہا کہ اُس نے اپنے کئے کی سزا پائی ہے۔ جگ موہن سنگھ کو چاہئیے تھا کہ فرانسس کو ہی حراست میں لے لیتا۔ اُس کے خلاف شک پختہ ہو سکتا تھا کہ رابرٹ اور اپنی بیوی کو اُسی نے قتل کرایا ہے اور خود الزام سے محفوظ رہنے کے لئے دَورے پر چلا گیا۔ قاتل کرائے کے تھے۔

رابرٹ کا باپ اور لواحقین آئی۔جی تک پہنچ گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ رابرٹ اور اپنی بیوی کو فرانسس نے قتل کرایا ہے اور جگ موہن سنگھ تفتیش میں گڑبڑ کر رہا ہے۔ اُنھوں نے جگ موہن سنگھ پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ اس نے فرانسس سے رشوت لی ہے۔ آئی۔جی نے یہ کیس انسپکٹر ڈوگن کے سپرد کر دیا اور مجھے اس کا معاون بنا دیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی۔ مقتولہ کا پیٹ چاقو یا تیز دھار آلے سے چیرا گیا تھا اور اس کے سینے پر اسی آلے کے تین چار گہرے زخم تھے۔ رابرٹ کے جسم پر چاقو کے کئی ایک زخم تھے۔ مجھے تعداد یاد نہیں رہی۔ اُس کے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر بھی چاقو کا کٹ تھا اور بازوؤں پر، کہنی اور ہاتھ کے درمیان بھی زخم تھے۔ ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مقتول نے مزاحمت کی تھی۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق دونوں آدھی رات کے وقت قتل ہوئے۔

ڈوگن نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ قاتل ایک نہیں،

دو یا تین ہیں۔ اگر قاتل اکیلا ہوتا تو وہ بیک وقت دونوں کو نہیں مار سکتا تھا۔ ایک پر وار کرتا تو دوسرا اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا یا باہر کو بھاگ کر شور شرابا کرتا۔ مقتولہ جوان تھی۔ وہ مقابلہ کر سکتی تھی۔ ڈوگن نے مجھے کہا کہ اگر یہ سوئے ہوئے تھے تو ایک آدمی دونوں کو قتل کر سکتا تھا۔ اُس نے پہلے مقتولہ کا پیٹ چاک کر کے اُسے بیکار کر دیا ہوگا پھر اُس نے رابرٹ پر حملہ کیا ہوگا۔ رابرٹ کی ہتھیلی اور بازوؤں پر جو زخم تھے ان سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے مزاحمت کی تھی۔ بہر حال قاتلوں کی تعداد جتنی بھی تھی، یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا صرف ایک قاتل ہاتھ آ جانے سے سب کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔

ہم نے سب سے پہلے خانساماں اور اس کی بیوی کا بیان لینے کا فیصلہ کیا۔ کوئی سراغ نہیں تھا۔ بیس روز گزر چکے تھے۔ لاشیں دفن ہو چکی تھیں۔ جائے واردات دُھل چکی تھی۔ کھرے (پاؤں کے نشان) بھی صاف ہو گئے تھے۔ جگ موہن سنگھ نے بتایا تھا کہ یہ خون آلود جوتیوں کے نشان تھے۔ قاتل کھڑکی کے راستے باہر نکلے اور کیاریوں میں سے گزر کر دیوار پھلانگ کر گئے۔ ہم نے اس سے ان کھروں کے متعلق ساری معلومات لیں۔ ہمیں اب اندھیرے میں بھٹکنا اور اندھوں کی طرح ٹٹولنا تھا۔

خانساماں نے وہی بیان دیا جو وہ پہلے جگ موہن سنگھ کو دے چکا تھا۔ ہم نے یہ خاص طور پر خیال رکھا کہ اس کے پہلے بیان اور

ہمارے سامنے دیتے ہوئے بیان میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ قاتل خانساماں بھی ہو سکتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اگر قاتل نہیں تو یہ قتل میں ملوث ہوگا۔ ہم نے دیکھا کہ اُس کے پہلے اور بعد کے بیان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ڈوبگن نے شک رفع کرنے کے لئے اس پر جرح کی۔ میں نے بھی بہت کریدا لیکن یہ آدمی بے گناہ تھا یا بہت چالاک۔

اس کے بعد ہم نے رابرٹ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔ ہمارے سوالوں کے جواب میں خانساماں نے بتایا کہ رابرٹ (مقتول) فرانسس کا دوست تھا۔ کبھی کبھی فرانسس کے گھر آتا تھا۔

"مقتول سے کبھی تنہائی میں ملا تھا؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"میں گھر میں کام کرتا ہوں" — خانساماں نے جواب دیا — "باہر کے متعلق میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"ہم گھر کی بات کر رہے ہیں" — میں نے وضاحت کی — "کبھی ایسا ہوا ہے کہ فرانسس صاحب قتل کی رات کی طرح کہیں باہر گئے ہوئے ہوں اور رابرٹ مسز فرانسس کے پاس آیا ہو؟"

خانساماں نے گھبراہٹ کا اظہار کیا۔ میری حوصلہ افزائی سے اُس نے جواب دیا — "تقریباً چھ مہینے گزرے، فرانسس صاحب دَورے پر گئے ہوئے تھے۔ میں علی الصبح بیڈ ٹی لے کر گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ہاتھ لگایا تو کھل گیا۔ میں بیڈ روم میں داخل ہوا۔ مسز فرانسس کو اکیلے ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ رابرٹ

بھی ڈبل بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ میں نے روز مرہ کی طرح ٹیبل لیمپ جلایا تو مسز فرانسس ہڑبڑا کر اُٹھی۔ رابرٹ کی بھی آنکھ کھل گئی۔ میم صاحب نے مجھے کہا کہ چائے رکھ کر چلے جاؤ۔ میں باہر آگیا۔ کوئی دس منٹ بعد رابرٹ بہت تیزی سے اندر سے نکلا اور چلا گیا۔ میم صاحب نے مجھے بلایا اور دس روپے کا نوٹ دے کر کہا کہ فرانسس صاحب کو اور کسی اور کو پتہ نہ چلے کہ رابرٹ صاحب یہاں سویا تھا۔ ہم غریب لوگ ہیں حضور! دس روپے ہمارے لئے بڑی رقم ہے۔ میں آج یہ بات آپ کو بتا رہا ہوں۔ اپنی بیوی سے بھی کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"رابرٹ صاحب رات کو کس وقت مسز فرانسس کے پاس آیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"میں نے اُسے آتے نہیں دیکھا" — اس نے جواب دیا — "میں رات دس گیارہ بجے کے درمیان اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔"

"رابرٹ کے علاوہ کوئی اور بھی مسز فرانسس کے پاس رابرٹ کی طرح کبھی آیا ہے؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"میں نے کسی کو کبھی دیکھا نہیں" — خانساماں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد رابرٹ فرانسس کی غیر موجودگی میں آتا رہتا ہو گا" — ڈوبگن نے کہا — "اب تو تم ان کے راز دار بن گئے تھے۔"

"اس کے بعد رابرٹ نہیں آیا" — خانساماں نے جواب دیا —

"اس کے بعد میں نے اسی بیڈ روم میں اُس کی لاش دیکھی۔"

"تم بتا سکتے ہو کہ فرانسس کو رابرٹ اور مسز فرانسس کی دوستی پر کبھی شک ہُوا تھا؟" — میں نے پُوچھا، اور اس کی سہولت کے لئے کہا — "تم میاں بیوی کی اندرونی باتوں سے واقف نہیں ہو سکے۔ اگر ان میں کبھی لڑائی جھگڑا ہُوا ہو تو یہ تو تمہیں معلوم ہو گا۔"

"لڑائی جھگڑا تو اُسی روز ہو گیا تھا جس صبح میں نے رابرٹ کو میم صاحب کے بیڈ روم میں سوتے دیکھا تھا" — خانساماں نے جواب دیا — "فرانسس صاحب بتا گیا تھا کہ تین روز بعد آئے گا لیکن وہ دوسرے ہی دن آ گیا۔ وہ دوپہر کے کھانے سے تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے مجھے اندر بلایا اور ایک سگریٹ کیس مجھے دکھا کر پوچھا کہ یہ کس کا ہے۔ یہ بڑا خوبصورت اور قیمتی سگریٹ کیس تھا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کس کا ہے۔ پھر اُس نے مجھ سے پُوچھا کہ رابرٹ صاحب یہاں آیا تھا؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اُسے اس بنگلے میں نہیں دیکھا۔ فرانسس صاحب نے مجھے دھمکی دی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، یہ سگریٹ کیس رابرٹ صاحب کا ہے، میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جو جواب دے چکا تھا میں اسی پر قائم رہا اور فرانسس صاحب کی منت کی کہ اپنے معاملوں میں مجھ غریب کو نہ گھسیٹیں ....

"اتنے میں میم صاحب دوسرے کمرے سے آ گئی۔ معلوم ہوتا تھا

کہ ان دونوں میں سگریٹ کیس پر جھگڑا ہو چکا ہے۔ میم صاحب نے فرانسس صاحب کو غصے سے کہا — "اس غریب کی جان نہ کھاؤ، میرے ساتھ بات کرو .... وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اگر تمہیں میرے چال چلن پر شک ہے تو مجھے طلاق دے دو" — اُس نے مجھے کہا کہ تم جاؤ، اپنا کام کرو۔"

"تم انگریزی سمجھ سکتے ہو؟"

"میں بچپن سے صاحب لوگوں کی نوکری کر رہا ہوں" — اس نے جواب دیا — "میں انگریزی سمجھتا بھی ہوں، بولتا بھی ہوں۔"

اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ انگریزوں اور اینگلو انڈین صاحبوں کے گھروں میں کام کرنے والے خانسامے اور بیرے وغیرہ ان پڑھ ہوتے ہوئے روانی سے انگریزی بول لیتے تھے۔

"فرانسس اور اس کی بیوی کا جھگڑا کہاں ختم ہُوا؟"

"مجھے باہر نکال دیا گیا تھا" — خانساماں نے جواب دیا — "میں ان کی آوازیں سُنتا رہا۔ میم صاحب نے فرانسس صاحب کی بہت بے عزتی کی تھی اور وہ بار بار طلاق کا نام لیتی تھی۔"

"مقتولہ کی شکل و صورت کیسی تھی؟"

"بہت خوبصورت تھی" — خانساماں نے جواب دیا — "اور فرانسس صاحب سے پندرہ سولہ سال چھوٹی تھی۔"

ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ رابرٹ اور فرانسس کا بھی اس بات

پر جھگڑا ہُوا تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق خانساماں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اس کے بعد رابرٹ فرانسس کے گھر نہ آیا۔ اُس رات آیا اور قتل ہو گیا۔ باہر کے متعلق خانساماں کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہم نے اُس کی بیوی سے..... پُوچھ گچھ کی۔ اس سے ہمارے مطلب کی کوئی بات معلوم نہ ہُوئی۔

اس کے بعد فرانسس کی باری آئی۔ اس کے متعلق جگموہن سنگھ نے ہمیں بتایا تھا کہ تفتیش میں تعاون نہیں کرتا۔ دراصل جگموہن سنگھ اس کے رُعب تلے آ گیا تھا کیونکہ فرانسس ایک تو اینگلو انڈین تھا، دوسرے وہ مرکزی حکومت (سیکرٹریٹ) کا افسر تھا۔ مجھ پر بھی اُس کا رُعب طاری ہو سکتا تھا لیکن ڈوبگن انگریز ہونے کی وجہ سے اُسے لگام ڈال سکتا تھا۔ ہم نے فرانسس کو بُلایا تو اس کے رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ ڈوبگن کو بھی پتے نہیں باندھے گا۔ ڈوبگن نے اس کے ساتھ اس کی بیوی کے قتل کی رسمی سی بات کی۔

"سُنو انسپکٹر!" — اُس نے ڈوبگن سے کہا — "بیوی میری قتل ہُوئی ہے۔ میں اس کیس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ اُس نے میرے ساتھ بے وفائی کی اور مجھے دھوکہ دیا۔"

"آپ کی بیوی ہی نہیں، اس کے ساتھ ایک آدمی بھی قتل ہُوا ہے" — ڈوبگن نے کہا۔

"مجھے نہ اپنی بیوی کے قتل کا افسوس ہے نہ رابرٹ کا" — فرانسس نے کہا — "دونوں نے اپنے کیے کی سزا پائی ہے۔"

"اور ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں اتنی بھیانک سزا کس نے دی ہے" — میں نے کہا۔

فرانسس نے مجھے گھُور کر دیکھا اور حکم کے لہجے میں کہا — "تم چُپ رہو۔"

اُس نے مجھے ہندوستانی اور اپنا غلام سمجھ کر چُپ رہنے کو کہا تھا۔ وہ صرف انگریز انسپکٹر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اُردو نہیں انگریزی بول رہا تھا۔ ڈوبگن کو فرانسس پر غصّہ آ گیا۔ اس نے کہا — "میں اپنے ساتھی (کولیگ) کے ساتھ یہ بدتمیزی برداشت نہیں کروں گا۔ آپ کو اپنی بیوی کے قتل کا افسوس ہے یا نہیں، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کا قاتل کون ہے۔ یہ دونوں آپ کے گھر میں قتل ہُوئے ہیں۔"

"میں گھر نہیں تھا" — اُس نے بے رُخی سے کہا — "جاؤ، معلوم کرو قاتل کون ہے۔"

"آپ بھی قاتل ہو سکتے ہیں ..... آپ کی بیوی کے ساتھ رابرٹ کے خفیہ تعلقات تھے، اور آپ کو معلوم تھا کہ رابرٹ آپ کی غیرحاضری میں آپ کی بیوی کے پاس آتا تھا" — ڈوبگن نے کہا۔

"مجھ پر قتل کا الزام عائد نہ کرو انسپکٹر!" — فرانسس نے بھڑک کر کہا — "آپ شاید میرے سرکاری رتبے سے واقف نہیں ہیں۔"

"اس وقت ہم آپ کے صرف ایک رُتبے سے واقف ہیں" — میں نے کہا — "اور ہمیں آپ کے اسی رُتبے سے دلچسپی ہے۔ آپ اس عورت کے خاوند تھے جو آپ کے بیڈ روم میں ایک غیر مرد کے ساتھ قتل ہو گئی ہے۔"

"اور وہ آدمی جو قتل ہو چکا ہے، اس سے پہلے بھی آپ کے بیڈ روم میں رات گزار گیا ہے" — ڈوبگن نے کہا — "اور آپ کو پتہ چل گیا تھا۔"

"انسپکٹر!" — اُس نے بڑے رُعب سے کہا — "آپ دونوں مجھے ناحق پریشان کر رہے ہیں۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں اُس سگریٹ کیس کی بات کر رہا ہوں جو آپ کو دَورے سے واپس آکر اپنے بیڈ روم میں ملا تھا" — ڈوبگن نے کہا — "اس سگریٹ کیس پر آپ کی اپنی بیوی کے ساتھ اتنی لڑائی ہوئی کہ بیوی نے آپ سے طلاق کا مطالبہ کیا۔"

"کیسا سگریٹ کیس؟ یہ کب کی بات ہے؟" — اُس نے کہا — "معلوم ہوتا ہے وہ غلیظ ہندوستانی (خانساماں) آپ کو جھوٹ موٹ کے

قصے سناتا رہا ہے۔ میں اُسے آج ہی گھر سے نکال دُوں گا۔"

"ہم چھ مہینے پہلے کی بات کر رہے ہیں" — ڈوبگن نے کہا — "اور ہم رابرٹ کے سگریٹ کیس کی بات کر رہے ہیں جو وہ آپ کے بیڈ روم میں بھول گیا تھا" — فرانسس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ ڈوبگن نے پُوچھا — "وہ آپ کا دوست تھا۔ اگر دن کے وقت آپ کی غیر حاضری میں آپ کے گھر آ گیا تو آپ اتنے غصّے میں کیوں آ گئے تھے؟"

ڈوبگن کا یہ سوال اُس کی باریک بینی اور عقلمندی کی دلیل تھا۔ اُس نے یہ سوچ کر یہ سوال کیا تھا کہ یہ تو صرف خانساماں کو معلوم تھا کہ رابرٹ نے رات فرانسس کے بیڈ روم میں گزاری تھی۔ فرانسس دوپہر کو گھر آیا اور اُس نے بیڈ روم میں رابرٹ کا سگریٹ کیس دیکھا تھا۔ انگریزی تہذیب اور آداب کے مطابق دن کے وقت کسی مرد کا کسی دوست کے گھر اُس کی غیر حاضری میں چلے جانا معیوب نہیں تھا، پھر فرانسس کو اتنا غصّہ کیوں آیا؟ کیا اسے شک تھا کہ رابرٹ اور اس کی بیوی کا در پردہ دوستانہ ہے؟

"میں رابرٹ کا اپنی غیر حاضری میں اپنے گھر آنا پسند نہیں کرتا تھا" — فرانسس نے جواب دیا۔

"اس کے بعد رابرٹ آپ کے گھر نہیں آیا؟" — میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے نہیں آیا" — اُس نے جواب دیا۔

"اُسے کس نے آپ کے گھر آنے سے منع کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "آپ نے یا آپ کی بیوی نے؟"

اُس کے ہونٹ ہلے لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کہے۔ اُس کا رعب داب ختم ہو چکا تھا۔ اُس کے غصّے پر برف پڑ گئی تھی۔ جواب دینے کی بجائے وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"مسٹر فرانسس!" ڈوبگن نے کہا۔ "آپ جتنا سچ بولیں گے اتنا ہی فائدے میں رہیں گے۔ کچھ چھپانے کی کوشش کریں گے تو آپ چھپا نہیں سکیں گے۔ اس صورت میں آپ ہماری مدد اور ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ آؤ، ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں .... ان کے سوال کا جواب دیں کہ رابرٹ کو آپ نے اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا یا آپ کی بیوی نے؟"

"میں نے!"

"اور وہ آپ سے لڑ پڑا!" ڈوبگن نے کہا۔ "میرا مطلب ہے وہ غصّے میں آگیا"

ڈوبگن نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ اُس نے فرانسس کو دیکھ لیا تھا کہ طبعاً غصیلا ہے، لہٰذا اُس نے رابرٹ کے ساتھ غصّے اور رُعب سے بات کی ہوگی۔

"مسٹر فرانسس!" ڈوبگن نے اُس کا جواب سُنے بغیر کہا۔ "اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے

کہ سگریٹ کیس پر جھگڑا آپ کے گھر کے اندر ہُوا تھا لیکن ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ اسی طرح باہر کی تمام باتوں کا جو آپ سے تعلق رکھتی ہیں ہمیں معلوم ہیں" ۔۔۔ حالانکہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"ہاں!" اُس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ بھی جھگڑا ہو گیا تھا"

"کہاں؟"

اُس نے کسی کا نام بتا کر کہا۔ "اُس کے گھر پارٹی تھی، رابرٹ بھی مدعو تھا۔ میں اُسے باہر لے گیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کس وقت میرے گھر گیا تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ نو دس بجے گیا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو دفتر کا وقت ہے، تم دفتر سے اُٹھ کر میرے گھر کیوں گئے تھے؟ اور تمہارا سگریٹ کیس بیڈ روم میں کیسے پہنچ گیا تھا؟ اس پر وہ گرم ہو گیا۔ میں نے غصّے کا جواب غصّے سے دیا۔"

"اور آپ دونوں بہت اونچی آواز میں بولنے لگے" ۔ ڈوبگن نے ہوا میں ایک اور تیر چلایا۔

"قدرتی بات ہے" اُس نے کہا۔ "اُس نے تو گھونسے تان لئے تھے"

"ہاں!" ڈوبگن نے کہا۔ "دوسرے مہمان نہ آجاتے تو آپ میں ہاتھا پائی ہو جاتی"

ڈوبگن یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان کی لڑائی کے عینی شاہد

کون کون ہیں۔

"میزبان بھی آگیا تھا" اُس نے کہا ۔۔۔ "میں نے اُسے غصّے سے کہا کہ اگر یہ (رابرٹ) پارٹی میں رہے گا تو میں نہیں رہوں گا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔"

"آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ آگئی تھی؟" ڈوبگن نے پوچھا۔

فرانسس نے یہ نہیں بتایا کہ اُس کی بیوی بھی پارٹی پر گئی تھی۔ ڈوبگن جانتا تھا کہ پارٹیوں وغیرہ میں بیویاں ساتھ جایا کرتی ہیں۔

"وہ اندر تھی" اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں اُسے بتائے بغیر آگیا تھا۔"

"وہ کب گھر آئی؟"

"آدھی رات کے قریب" اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "پارٹی ختم کر کے۔"

"پارٹی میں آپ جتنی دیر رہے، آپ کی بیوی کیا کرتی رہی؟"

"وہ رابرٹ کے ساتھ ناچتی رہی" اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُسی روز میرا بیوی کے ساتھ جھگڑا ہُوا تھا۔ اسے کم از کم میرے سامنے اس شیطان کے ساتھ ڈانس نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ایک ڈانس ختم ہُوا تو میں رابرٹ کو باہر لے گیا۔"

فرانسس نے کہا کہ یہ مقتولہ کی پسند کی شادی تھی، یعنی مقتولہ نے فرانسس کو پسند کیا تھا۔ مقتولہ کی عمر تئیس چوبیس سال بتائی گئی تھی۔

یہ دو سال پہلے شادی کے وقت کی عمر تھی۔ اُس وقت فرانسس کی عمر کم و بیش چالیس سال ہو چکی تھی۔ یہ بڑھاپے کی عمر تو نہیں تھی۔ اُس دَور میں صحت کا معیار اچھا تھا۔ چالیس سال عمر کا آدمی آج کے بائیس تیئس سال عمر کے جوان کی طرح ہوتا تھا، لیکن فرانسس اس قابل نہیں لگتا تھا کہ مقتولہ جیسی جوان لڑکی جو بہت خوبصورت بتائی گئی تھی، اسے پسند کرتی۔ فرانسس کا پیٹ بڑھا ہُوا، سر چھوٹا سا، کندھے سُکڑے ہُوئے اور شکل و صورت بھی کشش والی نہیں تھی۔ البتہ اپنی قبیل کی طرح اس کا رنگ گورا تھا۔ اب تو یہ ثابت ہو گیا تھا کہ یہ شادی محبت یا لڑکی کی پسند کا نتیجہ نہیں تھی کیونکہ اس لڑکی کا درپردہ میل جول رابرٹ کے ساتھ تھا۔

ہم نے اس ضمن میں اس سے کچھ نہ پوچھا لیکن وہ محبت کی رٹ لگاتا رہا۔ یہ معلوم کرنا کہ یہ شادی کس طرح ہُوئی تھی، مشکل نہیں تھا۔ مقتولہ کے والدین اور دیگر لواحقین موجود تھے۔ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ رابرٹ کا خاندان اور اس کی بیوی بھی تھی جو اب بیوہ ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ شادی مقتولہ کی پسند کی تھی یا فرانسس جھوٹ بول رہا ہے۔ ڈوبگن کی رائے یہ تھی کہ اس شخص نے کسی وجہ سے اپنے آپ کو اس لڑکی پر ٹھونس رکھا تھا، اور لڑکی اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ فرانسس کے مزاج کو ہم دیکھ چکے تھے۔ بھڑک اُٹھنے والا سنکی آدمی تھا۔ اس میں حاکمانہ پن

بھی تھا اور اس میں برداشت کی قوت بھی نہیں تھی۔ یہ اور ایک دو اور اوصاف اس میں ایسے تھے جو کسی بھی انسان کو قاتل بنا سکتے ہیں۔

"مسٹر فرانسس!"۔۔۔ ڈوگن نے اُس پر سیدھی چوٹ کی۔۔۔ "مجھے آپ کے ساتھ دِلی ہمدردی ہے۔ ہمدردی کے مستحق مقتولہ اور مقتول کے لواحقین نہیں آپ ہیں۔ زیادتی آپ کے ساتھ ہوئی ہے۔ آپ میرے ہم مذہب اور میری قوم کی نسل سے ہیں۔ میں عملی طور پر آپ کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے لئے ہمیں اپنے سینے ایک دوسرے کے سامنے کھولنے پڑیں گے۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپ سزا سے کس طرح بچ سکتے ہیں، اور آپ مجھے بتا دیں کہ آپ نے ان دونوں کو کس سے قتل کرایا ہے۔"

وہ کرسی سے اُچھل پڑا۔ غصّے کا یہ عالم کہ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس نے ہاتھ ڈوگن کی طرف بڑھا کر غصّے سے لرزتی آواز میں کہا۔۔۔ "مسٹر ڈوگن! میں ایسا بیہودہ الزام سُننے کا عادی نہیں ہُوں۔ تم ایک ہندوستانی کے سامنے میری توہین کر رہے ہو۔ میری اتنی یاد رہے کہ تم دونوں کو نوکری سے نکلوا سکتا ہوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مقتولہ مجھے چاہتی تھی اور رابرٹ اسے ورغلا رہا تھا۔"

مجھے توقع تھی کہ ڈوگن نے اگر اس کے مُنہ پر تھپڑ نہ مارا تو ڈانٹ ڈپٹ ضرور کرے گا، لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ سُرخ رنگ کا یہ گورا جو صحیح معنوں میں ہندوستان کا بادشاہ تھا، مسکرا رہا تھا

جیسے فرانسس کے ساتھ خوش گپیاں چل رہی ہوں۔ میں چونکہ خود تفتیش کے معاملے میں ٹھنڈے مزاج اور صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا کرتا تھا اس لئے ڈوگن کا ردِّعمل مجھے بہت پسند آیا۔ اگر تفتیشی افسر کی عقل کام کر رہی ہو تو وہ مزاج کی نرمی اور بُردباری سے وہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے جو تشدّد اور اذیت رسانی سے اکثر حاصل نہیں ہُوا کرتی۔

"مسٹر فرانسس!"۔۔۔ ڈوگن نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔۔۔ "کیا آپ کسی لڑکی کو ورغلانے کے اس طریقے کو دلچسپ اور عجیب نہیں سمجھتے کہ آدمی پوری رات اُس کے بیڈ روم میں گزارے؟"

فرانسس پر غصّے کا غلبہ تھا۔ اُس نے بے معنی اور بیکار سی باتیں کیں۔ اُسے اپنے سرکاری رُتبے اور اینگلو انڈین ہونے پر بڑا ہی ناز تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا۔۔۔ "سب انسپکٹر جگ موہن سنگھ نے میرے ساتھ ایسی توہین آمیز بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ میں نے اُسے صرف ایک بار کہا تھا کہ میں اس تفتیش میں نہ تعاون کروں گا نہ پیروی، اور اُس نے مجھے تفتیش سے خارج کر دیا تھا۔"

"آپ نے اس کا جو معاوضہ اُسے ادا کیا تھا وہ ہم دونوں کو بھی ادا کر دیں تو ہم بھی آپ کو تفتیش سے خارج کر دیں گے"۔۔۔ ڈوگن نے رشوت کا اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"کیا آپ قبول کر لیں گے؟"۔۔۔ اُس نے یکلخت اپنے لہجے میں

نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ معاوضہ (رشوت) صرف انڈین پولیس افسر لیتے ہیں۔"

"میں تین سال سے انڈیا میں ہوں"۔ ڈوگن نے کہا۔ "برطانیہ کی آب وہوا کا اثر بڑا عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔"

"تو پھر آپ لوگ میرے گھر آئیں"۔ فرانسس نے کہا۔ "اکٹھے پئیں گے"۔ اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "آپ بھی پیتے ہیں؟"

"بہت زیادہ"۔ میں نے جھوٹ بولا۔

مجھے معلوم تھا کہ ڈوگن اسے کس جال میں لا رہا ہے۔ نہ ڈوگن رشوت لیتا تھا نہ میں شراب پیتا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ فرانسس نے جگ موہن سنگھ کو رشوت دے کر اپنے آپ کو خارج از تفتیش کرالیا تھا۔ یہ باتیں پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہو رہی تھیں۔ ڈوگن اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھے کہا۔ "مسٹر خان! ابھی چلتے ہیں"۔ فرانسس کو دروازے سے نکال کر اُس نے میرے کان میں کہا۔ "دو کانسٹیبل ساتھ لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔ میں اس کے ساتھ جاتا ہوں۔"

وہ چلے گئے تو میں نے دو کانسٹیبلوں کا انتظام کیا۔ تانگہ منگوایا اور ڈوگن کے تانگے سے بہت سا فاصلہ رکھ کر فرانسس کے گھر پہنچ گیا۔ فرانسس اور ڈوگن برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں کانسٹیبلوں کے ساتھ ان کے پاس گیا تو ڈوگن نے فرانسس پر

بم گرا دیا۔

"مسٹر فرانسس!"۔ اُس نے فرانسس سے کہا۔ "میں نے آپ کے رُتبے کا لحاظ کرتے ہوئے آپ پر یہ کرم کیا ہے کہ آپ کو حوالات میں بند نہیں کیا۔ وہ بڑا ہی توہین آمیز طریقہ کار ہوتا ہے۔ ملزم کو ہتھکڑی لگا کر عدالت میں ریمانڈ کے لئے لے جایا جاتا ہے۔ لوگ تماشہ دیکھتے ہیں۔ اخباروں میں خبریں اور ملزم کی تصویریں چھپتی ہیں۔ میں آپ کو رسوائی سے بچا رہا ہوں۔ اس کی بجائے آپ کو گھر میں نظر بند کر رہا ہوں۔ یہ دو کانسٹیبل یہاں پہرے پر رہیں گے۔ آپ کا خانساماں اور اس کی بیوی یہاں آسکیں گے لیکن ان کی معرفت کوئی پیغام، زبانی یا تحریری باہر نہیں جاسکے گا۔ آپ برآمدے سے نیچے قدم نہیں رکھ سکیں گے۔ ان احکام کی ذرا سی بھی خلاف ورزی آپ کو حوالات میں بند کرا دے گی۔"

"مسٹر ڈوگن!"۔ فرانسس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟ میں آپ کو معاوضہ دینے یہاں لایا تھا۔"

"مگر میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں معاوضہ کس شکل میں لوں گا"۔ ڈوگن نے کہا۔ "میرا معاوضہ یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں آرام اور اطمینان سے رہیں اور ٹھنڈے دل سے سوچ کر مجھے تفصیل سے بتا دیں کہ آپ نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو کس طرح قتل کرایا ہے۔"

"میں قاتل نہیں ہوں" — فرانسس نے کہا۔
"یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ قاتل ہیں؟" — میں نے کہا — "ہم کہہ رہے ہیں کہ آپ قاتل یا قاتلوں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمیں بتا دیں اور عیش کریں۔ چاہے ایک اور شادی کر لیں۔"
"شٹ اپ یو انڈین" — اُس نے وہی جملہ کہا جو انگریزوں کی زبان سے اکثر ہندوستانیوں کو سُننا پڑتا تھا۔
ڈوبگن نے بڑا اچھا جواب دیا۔ یہ میں انگریزی میں ہی پیش کرتا ہوں:

I'D RATHER SHUT YOU UP

اور اُس نے کانسٹیبلوں کو اردو زبان میں ہدایات دینی شروع کر دیں کہ وہ بنگلے پر کس طرح پہرہ دیں۔ چار چار گھنٹے بعد پہرہ بدلنا تھا۔ انہیں بتایا کہ مسٹر فرانسس برآمدے سے باہر نہیں جا سکتا، باہر کا کوئی آدمی اندر نہیں جا سکتا۔ خانساماں کو بلا کر اُسے بھی احکامات سُنائے گئے اور کانسٹیبلوں سے کہا گیا کہ فرانسس صاحب گڑبڑ کریں یا بدتمیزی سے پیش آئیں تو دونوں کانسٹیبل کسی کے حکم کا انتظار کئے بغیر انہیں پکڑ کر متعلقہ تھانے کی حوالات میں بند کر دیں۔
اپنے دفتر میں آکر ڈوبگن نے پہلا کام یہ کیا کہ سب انسپکٹر جگ موہن سنگھ کے خلاف رشوت خوری اور تفتیش میں مجرمانہ غفلت کی رپورٹ لکھی اور اُس کی معطلی کے احکام جاری کرائے۔ اُس کی

دیدہ و دانستہ غفلت معمولی نہیں تھی۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اُس نے انتہائی اہم اور بڑے ہی واضح سراغ نظر انداز کئے جو کوئی اناڑی پولیس افسر بھی یوں ڈھٹائی سے نظر انداز نہیں کر سکتا۔
ڈوبگن نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگا کہ ہمیں اب غور کرنا ہے کہ قتل کا باعث کیا تھا اور دونوں کس طرح قتل ہوئے۔
ہم نے ان سوالوں کو سامنے رکھا اور غور کیا:
۱۔ یہ شادی کیسے ہوئی؟ یہ لڑکی کی پسند کی شادی نہیں ہو سکتی۔
۲۔ رابرٹ شادی شدہ تھا۔ اُس کی بیوی دونوں کو قتل کرا سکتی ہے۔ بیوی کے بھائی ہوں گے۔
۳۔ مقتولہ نے کسی اور کے ساتھ (رابرٹ کو بتائے بغیر) دوستانہ گانٹھ رکھا ہو گا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کا تعلق رابرٹ کے ساتھ بھی ہے تو اُس نے دونوں کو قتل کر دیا۔
۴۔ قتل کا باعث ڈاکہ یا چوری نہیں تھا۔ گھر سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔
۵۔ خانساماں بھی واردات میں ملوّث ہو سکتا ہے۔
۶۔ کیا فرانسس نے ہی دونوں کو قتل کرایا ہے؟
۷۔ قتل کا باعث کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رابرٹ کے ساتھ کسی اور کی دشمنی کسی اور وجہ سے ہو اور اُس نے رابرٹ کو قتل کرنے کے لئے فرانسس کے بیڈ روم کو بہترین

جگہ سمجھا ہو۔ پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے یہ جگہ موزوں تھی۔ مقتولہ کو اُس نے اس لئے قتل کیا ہو گا کہ کوئی گواہ نہ رہے اور اس لئے بھی کہ پولیس فرانسس کو قاتل سمجھے۔

ہمارا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ پختہ شک فرانسس پر ہی تھا۔ اس نے کرائے کے قاتل استعمال کئے ہوں گے۔ ہم نے یہ بھی ذہن میں رکھا کہ جس ظالمانہ طریقے سے چاقوؤں یا خنجروں سے دونوں کو قتل کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیشہ ور قاتلوں کا کام ہے۔ قاتل اگر عام شہری ہوتے تو وہ اناڑیوں کی طرح ایک ایک دو دو وار کر کے بھاگ جاتے۔

میں نے ڈوبگن سے کہا کہ میں زبردستی کی شادی کو خارج از بحث سمجھتا ہوں کیونکہ انگریزی اور اینگلو انڈین سوسائٹی میں رشتے والدین طے نہیں کیا کرتے۔ شادی لڑکی اور لڑکے کی پسند اور محبت سے ہوتی ہے۔ ڈوبگن نے کہا کہ ہوتا ایسے ہی ہے لیکن اینگلو انڈین آخر انڈین ہیں۔ ان میں کبھی کبھی والدین کی مرضی سے بھی شادیاں ہوتی ہیں۔ والدین ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح کسی مجبوری کے تحت یا پیسے کے لالچ میں آ کر یا کسی اور ناگزیر وجہ کی بنا پر جوان لڑکی کسی بوڑھے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ فرانسس اور مقتولہ کی شادی بھی کسی ایسی ہی مجبوری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ڈوبگن نے اس شک کا بھی اظہار کیا تھا کہ رابرٹ کی

بیوی نے یا بیوی کے بھائیوں نے رابرٹ اور مقتولہ کو قتل کرایا ہو گا کیونکہ دونوں انہیں دھوکہ دے رہے تھے۔ میں نے ڈوبگن سے کہا کہ دیہاتی علاقے میں ایسی وارداتیں ہوتی ہیں کہ کوئی آدمی کسی غیر عورت سے تعلقات پیدا کر لے تو اس آدمی کی بیوی یا بھائی یا جس عورت کے ساتھ اُس نے تعلقات پیدا کئے ہوں اُس کے بھائی وغیرہ اُس آدمی کو یا عورت کو یا دونوں کو قتل کر دیتے ہیں — کیا اینگلو انڈین سوسائٹی میں جہاں مرد اور عورت مادر پدر آزاد ہوتے ہیں، کسی عورت کے بھائی اتنے غیرت مند ہو سکتے ہیں کہ قتل کا ارتکاب کریں؟

"یہ ممکن ہے" — ڈوبگن نے کہا — "اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بھائی نہ سہی، اگر عورت انتقام پر اُتر آئے تو دو کی بجائے دس آدمیوں کو قتل کرا سکتی ہے .... اور مسٹر خان! آپ نے اس امکان پر غور نہیں کیا کہ رابرٹ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ اُس کی بیوی کی عمر اُس سے دو چار سال کم ہو گی۔ رابرٹ مقتولہ کو ناجائز حد تک چاہنے لگا تھا، لہٰذا اپنی بیوی سے کھچا کھچا رہتا ہو گا۔ اس کی بیوی نے انتقاماً کسی اور سے دل لگا لیا ہو گا اور اُسے کہا ہو گا کہ رابرٹ کو ختم کر دو اور ہم شادی کر لیں گے۔"

فرانسس کے بنگلے کے دائیں اور بائیں اسی طرح کے بنگلے تھے اور پیچھے بھی۔ پچھلے اور اگلے بنگلوں کے درمیان دس بارہ گز فاصلہ تھا۔ یہ ایک قسم کا کچا راستہ تھا۔ آج کل وہاں یہ بنگلے نہیں ہوں گے۔ ہو

سکتا ہے کئی کئی منزلہ فلیٹ یا کوٹھیاں بن گئی ہوں اور اس جگہ کو دیکھوں تو میں پہچان بھی نہ سکوں۔ واردات کے زمانے میں یہ علاقہ وسیع میدان تھا جس میں یہ بنگلے اور ان جیسے چھوٹے کوارٹر نما بنگلے بکھرے ہوتے تھے۔ وہاں درخت بھی خاصے تھے۔ یہ جگہ گنجان آبادی سے ہٹی ہوئی تھی۔ یہاں سب اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائی رہتے تھے۔

ہم دونوں وہاں گئے۔ فرانسس کے دائیں اور بائیں بنگلوں کے مکینوں کو قتل کی رات یاد دلا کر پوچھا کہ اُس رات انہوں نے واردات والے بنگلے میں کوئی غیر معمولی آواز، چیخ یا شور شرابہ سُنا تھا؟ — اُنہوں نے جواب دیا کہ کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنائی دی۔ اس کے بالکل پیچھے جو بنگلہ تھا، وہاں گئے۔ وہاں اینگلو انڈین گھرانہ رہتا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قاتل پچھواڑے سے واپس گئے تھے۔ اُن کے خون آلود کھُروں کا رُخ اسی طرف تھا۔ پچھلے بنگلے کے ارد گرد بھی گز ڈیڑھ گز اُونچی دیوار تھی۔ اس میں رہنے والے نے قتل کی رات یاد کرتے ہوتے بتایا کہ رات بارہ بجے کے بعد اُس کا کُتا جو رات کو کھُلا رہتا تھا، بھونکا۔ اس آدمی کی آنکھ کھل گئی اور باہر آیا۔

کُتے کے بھونکنے کا انداز بتاتا تھا کہ اس نے کسی اجنبی انسان کو بنگلے کے احاطے میں آتے دیکھا ہے۔ یہ رکھوالی والا کُتا تھا۔ علاقہ کھُلا تھا اور گنجان آبادی سے دور، اس لئے چوری ڈکیتی کا خطرہ موجود

تھا۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں ہوتی تھیں۔ امیروں کے گھروں میں ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بنگلوں میں رہنے والوں نے اپنے طور پر چوکیداروں کا انتظام کر رکھا تھا اور بعض کے پاس رکھوالی والے کُتے تھے۔ اس آدمی کا کُتا رات کو بھونکا تو وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ چاندنی رات تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا کُتا پھاٹک کے اندر کھڑا بھونک رہا تھا اور ایک تانگہ پھاٹک سے ذرا دُور جا رہا تھا۔

"ذہن پر اور زور دیں" — میں نے اُسے کہا — "تانگہ پھاٹک کے سامنے رُکا اور چلا تھا یا آ رہا تھا اور گزر گیا؟"

میں نے یہ سوال اس لئے پوچھا تھا کہ اس بنگلے کا پھاٹک فرانسس کے بنگلے کے بالکل پیچھے تھا۔ مجھے یہ خیال آ گیا تھا کہ قاتل تانگے پر آئے تھے۔ تانگہ یہاں رُکا۔ قاتل اندر گئے اور اپنا کام کر کے واپس آئے۔ تانگے میں بیٹھے اور تانگہ چل پڑا۔

اُس نے ذہن پر زور دیا۔ آدمی ذہین معلوم ہوتا تھا۔ بہت دیر یاد کرتے کرتے اس نے کہا — "معلوم ہوتا تھا کہ تانگہ رُکا رہا پھر چلا کیونکہ میں جب باہر آیا تو گھوڑے کے قدموں کی آواز تھوڑی تھی، پھر رفتار تیز ہوئی اور یہ آوازیں مجھے سُنائی دیتی رہیں۔ تانگہ بہت تیز ہو گیا تھا۔ میں پھاٹک تک گیا اور چوکیدار کو پکارا۔ وہ یہیں قریب ہی تھا۔ اس سے پوچھا کہ تانگہ کہاں رُکا تھا؟ اس میں کون آیا تھا؟ چوکیدار نے بتایا کہ وہ کسی بنگلے کا نمبر بتا رہے تھے۔ (مجھے یہ نمبر یاد نہیں رہا)

چوکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ غلط جگہ آ گئے تھے اور اس نے انہیں واپس بھیج دیا ہے۔"

"یہاں ایک ہی چوکیدار ہے؟"

"دو ہیں" — اُس نے جواب دیا۔ "ایک مسلمان ہے دوسرا گورکھا۔ دونوں نے علاقہ بانٹ رکھا ہے۔ ہمارے علاقے والا مسلمان ہے۔"

اس بستی کے تمام مکین بُری طرح ڈرے ہوئے تھے۔ ایک ہی بار دو قتل معمولی واردات نہیں تھی۔ اس ڈر کا یہ فائدہ تھا کہ تفتیش میں وہ بہت تعاون کرتے تھے۔ ڈوبگن نے اس صاحب سے رابرٹ، فرانسس اور مقتولہ کے متعلق پوچھا۔ اُس نے ناک سکیڑ کر کہا —

"اس گھر میں یہی کچھ ہونا تھا۔ فرانسس گھٹے ہوئے مزاج کا آدمی ہے۔ ایک غریب گھرانے سے اسے یہ لڑکی مل گئی تھی۔ رابرٹ بدقماش آدمی تھا۔ اتنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر یہاں آتا تھا۔"

"ایسے ہی چوری چھپے آتا تھا؟"

"کئی بار رات کو اس گھر میں آتے اور نکلتے دیکھا گیا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"فرانسس تو کہتا ہے کہ مقتولہ اسے بہت چاہتی تھی" — ڈوبگن نے کہا۔

اس آدمی کی میم صاحب پاس ہی کھڑی تھی۔ اُس نے لمبی "ہاہاہا" کہی اور بولی — "اِس خبیث کو تو ہمارا کُتّا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اُس

کی دونوں بیویاں خوش قسمت تھیں کہ مر گئیں۔"

"یہ شادی کیسے ہُوئی تھی؟" — ڈوبگن نے پُوچھا۔

"ہم سب حیران ہیں" — اس آدمی نے جواب دیا۔ "ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ لڑکی غریب خاندان کی تھی اور بہت خوبصورت۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شادی کے بہانے اس نے یہ لڑکی خریدی تھی۔"

"آپ نے تانگے کا ذکر اُس تھانیدار سے کیا تھا جس نے پہلے تفتیش کی تھی؟"

"اُس نے ہم سے پوچھا ہی نہیں" — اُس نے جواب دیا۔ "ہم نے ازخود بتانا مناسب نہ سمجھا۔"

اس سے مسلمان چوکیدار کا ٹھکانہ معلوم کر کے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اُسے ہمارے دفتر لے آتے۔ میں اور ڈوبگن یہ رائے لے کر وہاں سے چلے کہ واردات میں تانگہ استعمال ہُوا ہے اور یہ بھی کہ یہ کرائے کے قاتل تھے اور یہ فرانسس کے بلائے ہُوئے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ چوکیدار کو ان میں سے کسی کا چہرہ یاد ہے۔ چاندنی تھی۔ چہرے یاد رکھنا مشکل تھا۔ یہاں تانگے کے متعلق یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ زمانہ کاروں اور موٹر سائیکلوں کا نہیں تانگوں کا تھا۔ تانگے پر بھی کوئی روپے پیسے والا ہی سوار ہوتا تھا۔ سائیکل کسی قسمت والے کو نصیب ہوتی تھی۔

چوکیدار کے متعلق میں نے پہلے سوچا ہی نہیں تھا۔ شہروں

میں چوری اور ڈکیتی کی اکثر وارداتیں چوکیداروں کو ساتھ ملا کر کی جاتی تھیں۔ دوہرے قتل کی اس واردات میں بھی جب چوکیدار کا ذکر آیا تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے ڈوبگن کو بتایا کہ اکثر وارداتوں میں چوکیدار بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ڈوبگن نے کہا — "میں جانتا ہوں۔ تین سال سے ہندوستان میں ہوں۔ اس سے پہلے چوکیدار میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔"

چوکیدار آگیا۔ دلی کے گرد و نواح کا رہنے والا سابق فوجی تھا۔ اپنے آپ کو پٹھان کہتا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ میں نے اسے پولیس کی شکی نگاہوں سے دیکھا۔ جسم کا پھرتیلا تھا۔ اس سے جب باتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ جسم کی نسبت زبان کا زیادہ تیز ہے۔ اسے قتل کی رات یاد دلا کر پوچھا کہ اس تانگے میں کون آیا تھا؟ — اس نے بتایا کہ کوئی دیسی (ہندوستانی) تھے۔ اس نے کوئی نمبر بتا کر کہا کہ اس بنگلے کی تلاش میں تھے۔ میں نے پوچھا کہ اگر ان میں سے کوئی اس کے سامنے آئے تو وہ اسے پہچان لے گا؟ اس نے کہا کہ نہیں پہچان سکے گا۔

میں نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ اس کے جوابوں سے معلوم ہوا کہ وہ رات بھر جاگتا ہے۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ فرانسس دورے پر گیا ہوا تھا اور گھر میں اس کی بیوی اکیلی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ فرانسس

دورے پر جاتے اسے کہہ گیا تھا کہ اس کے گھر کا خیال رکھے، اور اس نے گھر کا خیال رکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ قتل کی رات اس نے فرانسس کے گھر کسی کو جاتے یا آدھی رات کے وقت وہاں سے کسی کو نکل کر جاتے دیکھا تھا؟ اس نے نفی میں جواب دیا اور یہ بھی کہا — "صاحب لوگ اور ان کی میمیں رات دیر تک آتی رہتی ہیں۔ میں صرف مشکوک آدمیوں پر نظر رکھتا ہوں۔"

"قتل کی رات تم کہاں تھے؟" — میں نے پوچھا — "تم جھوٹ بولتے ہو کہ ساری رات جاگتے رہتے ہو۔"

"اس رات گورکھا چوکیدار چھٹی پر تھا" — اس نے جواب دیا — "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تم ایک دو راتیں چھٹی کر لو، میں تمہارے علاقے کا خیال رکھوں گا۔ قاتل اس وقت آئے ہوں گے جب میں گورکھے کے علاقے میں چلا گیا تھا۔"

اس نے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے افسوس اور شرم کا اظہار بھی کیا کہ اس کے علاقے میں قتل کی واردات ہو گئی ہے۔ میں نے اور ڈوبگن نے اس پر بہت جرح کی۔ اس نے بڑے اچھے جواب دیئے۔ وہ نہ گھبرایا ہوا تھا نہ ڈرا ہوا۔ اس نے ہمارا شک رفع کر دیا۔

ڈوبگن نے مقتولہ کے والدین سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اس کے والدین جھوٹ بول سکتے ہیں۔ پہلے

کہیں اور سے معلوم کیا جاتے کہ یہ شادی ہُوئی کیسے۔ ڈوبگن کی نظر گہری تھی۔ وہ اپنی اور اینگلو انڈین برادری کے رسم ورواج سے واقف تھا۔ اُس نے کہا کہ اُس پادری سے ملتے ہیں جس نے شادی کرائی تھی۔ پادری کا نام پتہ معلوم کرلیا گیا اور ہم پادری کے ہاں گئے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ ہماری شادیاں کس طرح ہوتی ہیں۔ یُوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکی نہ ہاں کہتی نہ اُس کے مُنہ سے نہ نکلتی ہے اور یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ لڑکی نے اس لڑکے کو قبول کرلیا ہے۔ لڑکی گٹھڑی بنی ہوتی ہوتی ہے۔ وہ ہاں یا نہ میں سر ہلاتے تو بھی پتہ نہیں چلتا۔

عیسائیوں کے ہاں یوں نہیں ہوتا۔ گرجے میں لڑکی اور لڑکا پادری کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ لڑکی کا چہرہ بھی ننگا ہوتا ہے۔ مہمان دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پادری بلند آواز سے ایجاب وقبول کراتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے کی آواز سب کو سنائی دیتی ہے۔

ہم پادری سے ملے۔ وہ خالص انگریز تھا۔ ڈوبگن نے اپنا اور میرا تعارف کرایا اور ملاقات کا مدعا بیان کیا۔ ڈوبگن نے اُسے کہا کہ دو سال گزرے فرانسس نے مقتولہ کے ساتھ شادی کی تھی۔ کیا پادری کو یاد ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت لڑکی خوش تھی، یعنی پادری یہ کہہ سکتا ہے کہ لڑکی نے محبت کی خاطر فرانسس کو قبول کیا تھا؟

"دو سال گزر گئے ہیں"۔ پادری نے کہا۔ "اس عرصے میں

کتنی شادیاں کرا چکا ہُوں۔ ہر دلہن اور دولہا کے چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ ہوتی ہے۔ میں نے کبھی غور سے نہیں دیکھا کہ کسی کے چہرے پر کیا غیر معمولی تاثر آتا ہے۔ تاہم آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ میں نے دو ہی سال پہلے اس لڑکی کی شادی فرانسس سے کرائی تھی۔ رابرٹ کی شادی اس سے دو سال پہلے میں نے ہی کرائی تھی۔ میں جب دونوں کے جنازوں کے ساتھ قبرستان تک گیا تو میرے دل پہ بڑا ہی ناگوار بوجھ تھا۔ ایک یہ کہ بدکاری کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ یہ دونوں قتل ہو گئے اور ایک یا دو آدمی پھانسی پہ چڑھا دیتے جائیں گے....

"دوسرے جس خیال نے مجھے بہت دُکھ دیا وہ یہ تھا کہ لڑکی اپنے گناہ کی ذمہ دار خود نہیں تھی۔ آج آپ کے ذہن میں جو سوال پیدا ہُوا ہے یہ لڑکی کے جنازے پہ میرے ذہن میں پیدا ہُوا تھا مجھے وہ وقت یاد آیا جب یہ لڑکی دلہن بنی فرانسس کے ساتھ میرے سامنے گرجے میں کھڑی تھی۔ میں نے ایجاب وقبول کرایا تو لڑکی نے میرے سوال کے جواب میں کہہ تو دیا تھا کہ وہ فرانسس کو اپنا خاوند تسلیم کرتی ہے اور ساری عمر اس کی وفادار رہے گی لیکن اُس نے مسرت سے مُسکرانے کی بجائے سر جھکا لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اتنی حسین اور پُرکشش لڑکی کے چہرے پر اُداسی تھی۔ میں ان کا مذہبی پیشوا ہُوں۔ مجھے ایسی بات کہنی تو نہیں

چاہیے، لیکن قتل کا معمہ حل کرنے کے لئے کوئی بات چھپانی بھی نہیں سکتا.... فرانسس اس قابل نہیں تھا کہ یہ لڑکی اُسے پسند کرتی۔"

"ایک عام شہری کی حیثیت سے آپ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ اس بے جوڑ شادی کا پس منظر کیا ہے۔" ڈوبگن نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں کے ذاتی معاملات کو نہیں کریدا کرتا۔" پادری نے جواب دیا۔ "لیکن یہ شادی ایسی تھی کہ چہ میگوئیاں ہوئیں جو میرے کانوں میں بھی پڑیں۔ لڑکی کے والدین نے کسی مجبوری کے تحت اپنی لڑکی فرانسس کو دی تھی۔ مجبوری غالباً مالی تھی۔ فرانسس اس خاندان پر چھا گیا تھا۔ یہ بھی سُننے میں آیا تھا کہ لڑکی کا باپ دفتر میں غبن کے جرم میں دھر لیا گیا تھا لیکن اُسے کوئی سزا نہ ملی معاملہ غالباً دبا دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد فرانسس کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔"

ڈوبگن نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے یہ بات ذہن میں محفوظ کر لی۔

"آپ تک کبھی کوئی ایسی بات پہنچی ہے کہ رابرٹ کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟" ڈوبگن نے پوچھا۔

"نہیں!" پادری نے جواب دیا۔ "البتہ رابرٹ اچھی شہرت کا آدمی نہیں تھا۔"

"اور مقتولہ کے چال چلن کے متعلق آپ کی کوئی رائے ہو؟"

"جیسی سب اینگلو انڈین لڑکیاں ہوتی ہیں۔" پادری نے جواب دیا۔ "میں سند نہیں دے سکتا کہ اس کا چال چلن اچھا تھا اور میں بُرا بھی نہیں کہہ سکتا۔ ان لوگوں میں یہ خرابی ہے کہ اپنے آپ کو مکمل برطانوی انگریز سمجھتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ اپنے وطن کی تہذیب کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ تمہارا مذہب عیسائیت اور تمہارا وطن ہندوستان ہے۔ اپنی تہذیب سے نفرت نہ کرو اور سچے عیسائی بنو مگر یہ لوگ سچے عیسائی بننے کی بجائے انگریز بننے کی کوشش کرتے اور گمراہ ہوتے ہیں۔"

"مقتولہ کے متعلق آپ شاید وثوق سے نہیں بتا سکتے کہ چال چلن کی اچھی تھی یا بُری؟" ڈوبگن نے کہا۔

"نہیں۔" پادری نے جواب دیا۔ "اس کی شادی سے پہلے اور بعد میں مجھے بعض افراد نے شکایت کے لہجے میں کہا تھا کہ اس لڑکی کے تعلقات ایک مسلمان امیرزادے کے ساتھ ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر آپ کو بُرا لگے تو مجھے معاف کر دینا۔ جس طرح آپ پسند نہیں کرتے کہ آپ کے مذہب کی لڑکی ہمارے مذہب کے کسی آدمی کے ساتھ محبت کرے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ معیوب سمجھا جاتا ہے کہ عیسائی لڑکی کسی

غیر مذہب کے آدمی کے ساتھ تعلقات رکھے۔"

میں نے دل میں اُسے معاف کرتے ہوئے کہا۔"آپ اس امیرزادے کا نام وغیرہ بتا سکتے ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اس لڑکی سے کہا تھا کہ وہ غیر مذہب کے کسی آدمی کے ساتھ دوستی نہ لگاتے۔ اُس نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ اُس کی محبت پاک صاف ہے اور وہ اسے عیسائی بنا کر اُس کے ساتھ شادی کرے گی۔ یہ اُس کی شادی سے پہلے کا ذکر ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ مسلمان اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ تم جذبات میں آکر اپنا مذہب چھوڑ بیٹھو گی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ عیسائی نہ ہوا تو وہ اس آدمی کو دل سے اُتار دے گی۔ اس کے بعد اُس کی شادی فرانسس کے ساتھ ہو گئی۔"

"میرا خیال تھا کہ ہم پادری کے پاس آکر محض وقت ضائع کریں گے" — میں نے پادری سے رُخصت ہو کر اپنے دفتر کے راستے میں ڈوگن سے کہا — "لیکن یہاں سے کام کے سراغ مل گئے ہیں۔"

"مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ ہم اُسی راستے پر جا رہے ہیں جس پر قاتل بھاگا جا رہا ہے" — ڈوگن نے کہا — "اب ہمیں مقتولہ کے والدین کے پاس جانا چاہیئے میرا خیال ہے کہ مقتولہ کی شادی

اس لئے فرانسس کے ساتھ کر دی گئی تھی کہ وہ اس مسلمان امیرزادے سے ہٹ جاتے۔"

"اس صورت میں لڑکی اس مسلمان کے ساتھ فرار ہو سکتی تھی" — میں نے کہا — "مسلمان امیرزادے کی محبت والا قصّہ ضمنی اور غیر اہم لگتا ہے۔"

شام کھانے کے بعد ہم مقتولہ کے والد کے گھر کا اتا پتہ لے کر وہاں گئے۔ وہ فرانسس کے گھر سے دُور رہتا تھا۔ اُس کا گھر دیکھ کر ہی جان گئے کہ غریب آدمی ہے۔ وہ بھی اینگلو انڈین تھا۔ تین کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔ ہمیں اُس نے جس کمرے میں بٹھایا وہاں کا فرنیچر اُس کی مالی مجبوریوں کی داستان سُنا رہا تھا۔ وہ اپر گریڈ کلرک تھا۔ اولاد اتنی زیادہ تو نہیں تھی لیکن پینے پلانے اور اپنے آپ کو انگریز ثابت کرنے میں تنخواہ ختم ہو جاتی تھی۔ اُس کا بیٹا کوئی نہیں، تین لڑکیاں تھیں۔ مقتولہ سب سے بڑی تھی۔ مقتولہ کی ماں کو دیکھا۔ بڑھاپے میں بھی خوب صورت لگتی تھی۔ مقتولہ کی چھوٹی بہنوں کو دیکھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ مقتولہ اگر ان سے کم حسین تھی تو بھی بہت حسین ہو گی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ڈوگن نے مقتولہ کے باپ سے پوچھا کہ انہیں کسی پر شک ہے؟ اُس نے کسی پر شک کا اظہار نہ کیا۔

"فرانسس قتل کرا سکتا ہے؟"

"نہیں" — باپ نے جواب دیا — "فرانسس ایسا کام نہیں کر سکتا۔"

"کیا آپ کی بیٹی نے واقعی فرانسس کو پسند کر کے اُس کے ساتھ شادی کی تھی؟"

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔"

"پھر آپ کی بیٹی رابرٹ کو کب سے چاہنے لگی تھی؟" — ڈوبگن نے پوچھا — "اس میں تو کوئی شک نہیں رہا کہ رابرٹ آپ کی بیٹی کے بیڈ روم میں مارا گیا ہے۔"

"یہ ایک سکینڈل معلوم ہوتا ہے" — مقتولہ کے باپ نے کہا — "قصہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ ہماری بیٹی بے گناہ ماری گئی ہے۔"

"آپ کے غبن کے کیس کا کیا بنا تھا؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔ اس آدمی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ڈوبگن نے اُسے جواب دینے کی مہلت نہ دی اور پوچھا — "فرانسس کے اثر ورسوخ سے شاید آپ کے جرم کو دفن کر دیا گیا تھا" — ڈوبگن نے اپنے تجربے کی بنا پر ہوا میں تیر چلایا۔

وہ خالی خالی نظروں سے ڈوبگن کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہم اس کیس کی تمام تفصیل آپ کے دفتر سے معلوم کر لیں گے۔"

میں نے کہا — "اگر آپ نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو ہم اس کیس کو زندہ کر کے انکوائری شروع کرا دیں گے۔ اس وقت قتل کی واردات کی تفتیش کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمیں وہ سب کچھ بتا دیں گے جو آپ جانتے ہیں تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے غبن کو نہیں چھیڑیں گے۔ ہم اسے نظر انداز کر دیں گے۔ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی بیٹی نے فرانسس جیسے بھدے آدمی کو کس طرح قبول کر لیا تھا۔"

"میری بیٹی نے میری خاطر قربانی دی تھی" — اُس نے کہا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ہم دونوں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی اور حوصلہ افزائی بھی کی اور اُسے ایک بار پھر یقین دلایا کہ اُس کے دفتر کے کیس کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ اس کیس کو دفن ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کر دیا۔ کہنے لگا — "اکیلا کمانے والا ہوں۔ تنخواہ کم اور اخراجات زیادہ ہیں۔ گھر کا سٹینڈرڈ قائم رکھنے میں زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ فرانسس کی بیوی مر گئی تھی۔ اُس نے کہیں میری لڑکی کو دیکھ لیا اور ہمارے ہاں آنے جانے لگا۔ وہ افسر ہے۔ میری بیٹی کو وہ پیسے اور تحفے دینے لگا۔ اس بہانے وہ دراصل میری مالی مدد کر رہا تھا۔ میری بیٹی اُس کے دیئے ہوئے پیسے مجھے دے دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ میرے لئے وِسکی کی بوتل لے آتا تھا۔ اُس نے مجھے ترقی

دلائی میں مالی لحاظ سے تنگ رہتا تھا....

"ایک روز دو ہزار اور چند سو روپے سرکاری رقم میرے ہاتھ آگئی جو میں نے اُڑالی۔ میں پکڑا گیا۔ محکمانہ انکوائری ہوئی۔ کیس پولیس کے پاس جا رہا تھا۔ میں نے فرانسس سے کہا کہ مجھے بچاؤ۔ اُس نے کیس دیکھا اور میرے گھر آکر مجھے بتایا کہ کیس پولیس کے پاس جا رہا ہے اور کم از کم پانچ سال سزائے قید ہوگی۔ مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ میں نے اُس کی منت سماجت کی۔ وہ پہلے مجھے یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ وہ اپنی نوکری کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میں اُس کے پیچھے پڑا رہا۔ آخر اُس نے کہا کہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو۔ کیس دبوا دوں گا۔ اس کیس کے علاوہ میری ایک اور مصیبت یہ تھی کہ میں فرانسس کا مقروض بھی تھا۔ اُس نے مجھ سے میری بیٹی مانگ کر یہ بھی کہا تھا کہ یہ رقم معاف کر دوں گا۔ میں تو سیدھا جیل جا رہا تھا۔ میں نے فرانسس سے سوچنے کی مہلت مانگی اور اپنی بڑی بیٹی (مقتولہ) کے ساتھ بات کی.....

"میں غریب آدمی ہوں لیکن پیار اور محبت کے معاملے میں میں بہت امیر ہوں۔ اپنی بیٹیوں کو میں نے بہت پیار دیا ہے۔ ان کی ضروریات کا اور ان کے جذبات کا بھی میں نے بہت خیال رکھا ہے۔ غربت کے باوجود میں نے ان کی ہر فرمائش پوری کی ہے۔

اس کے جواب میں میری بیٹیاں میرے ساتھ اتنا پیار کرتی ہیں جیسے کسی کی عبادت کی جاتی ہے..... میں نے بڑی بیٹی سے کہا کہ فرانسس اُس کے ساتھ شادی کرنے کو کہہ گیا ہے۔ میری بیٹی کا تو رنگ ہی اُڑ گیا۔ اسے انکار کر دینا چاہیئے تھا لیکن وہ میرا فیصلہ سُننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم نے فرانسس کی اس خواہش کو جو دراصل اُس کی شرط تھی، ٹھکرا دیا تو میں چار پانچ سالوں کے لئے قید ہو جاؤں گا۔ پیچھے تین لڑکیاں اور ان کی ماں رہ جائے گی۔ بدقسمتی سے لڑکیاں خوبصورت ہیں۔ یہ باپ کی زندگی میں یتیم اور بے آسرا ہو جائیں گی اور ان کا جو انجام ہوگا اس کا میں تصور کر سکتا ہوں....

"لڑکی عقلمند تھی اور اُسے میرے ساتھ، اپنی ماں اور اپنی بہنوں کے ساتھ بہت پیار تھا۔ اُس کے الفاظ مجھے ساری عمر یاد رہیں گے اور مجھے اذیّت دیتے رہیں گے۔ اُس نے کہا — 'آپ غم نہ کریں۔ میں آپ کو جیل سے بچانے اور بہنوں کا مستقبل روشن کرنے کے لئے اپنا مستقبل تاریک کر لوں گی۔ اُسے کہیں کہ پہلے آپ کا کیس ختم کرائے پھر میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی' — اُس نے مجھے ایسی اذیّت سے بچا لیا تھا جو میری برداشت سے باہر تھی۔ اگر مجھے جیل جانا پڑتا تو میں زندہ نہ رہ سکتا۔ خودکشی کر لیتا، لیکن خدا نے مجھے سزا دی۔ میری بیٹی قتل ہوگئی۔ اب ساری عمر اُس کی قربانی مجھے اذیّت دیتی رہے گی۔"

اتنی مدت گزر جانے کے باوجود یہ آدمی اور اس کے الفاظ مجھے
یاد ہیں۔ اس کے آنسو اسی طرح بہہ رہے تھے جس طرح اس کے منہ
سے الفاظ نکل رہے تھے۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا اور آج
بھی میری وہی سوچ ہے کہ اپنے پادری کے کہنے کے مطابق اگر یہ
شخص اپنی تہذیب اور اپنے وطن کی معاشرتی اقدار ترک نہ کرتا تو اتنا
غریب نہ ہوتا۔ اس دور میں اسے جو تنخواہ مل رہی تھی وہ پانچ افراد کے
کنبے کو باعزت روٹی دینے اور ہر ضرورت پوری کرنے کے لئے
کافی تھی۔ اس کی غربت کا ذمہ دار مذہب نہیں تھا۔ وہ عیسائی ہی رہتا
لیکن انگریز بننے کی کوشش نہ کرتا۔ شراب نہ پیتا اور اپنا رہن سہن
ہندوستان کے متوسط اور شریف طبقے کی طرح رکھتا تو اسے غبن
کا جرم نہ کرنا پڑتا اور اسے اپنی بیٹی بھی قربان نہ کرنی پڑتی۔ ذرا غور
کریں کہ قرآن نے شراب اور فضول خرچی کو حرام قرار دے کر انسان
پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

"میری بیٹی نے اپنے جذبات بھی قربان کر دیئے تھے"۔۔۔ اس
نے کہا۔۔۔ "وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ یہاں میں شرمسار ہو کر یہ اعتراف
کرتا ہوں کہ بیٹی نے ایک قربانی مجھ سے مانگی جو میں نہیں دے
سکا"۔۔۔ پادری کی طرح اس نے بھی مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔
"میں آپ سے معذرت کے ساتھ آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہ ایک مسلمان
کو چاہتی تھی۔ میں نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا۔ اس کے نام اور پتے

کا بھی علم نہیں۔ وہ میری بیٹی کو پیسے دیا کرتا تھا جو وہ اپنی ماں کو دے
دیا کرتی تھی۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ کر کہا کہ تم عصمت فروشی
کر رہی ہو۔ اس نے قسمیں کھائیں۔ گرجے میں چلنے اور انجیل ہاتھ میں
لے کر پادری کے سامنے قسم کھانے کو کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ
بہت امیر آدمی ہے اور ان کی محبت پاک ہے اور وہ شادی کا عہد
کر چکے ہیں۔ بیٹی نے یہ بھی بتایا کہ یہ آدمی عیسائیت قبول کرنے کو تیار
ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ان امیرزادوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور
جب انسان پر محبت کے جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے تو مذہب بے معنی
ہو کے رہ جاتا ہے۔ میں نے بیٹی سے کہا کہ عورت کے جذبات
زیادہ نازک ہوتے ہیں، اس لئے ہوگا یہ کہ تم مسلمان ہو جاؤ گی....
اس کے بعد فرانسس آن ٹپکا اور میری بیٹی نے اپنا مستقبل اور اپنے
جذبات قربان کر دیئے"۔

"اور یہ مقتول رابرٹ کہاں سے آن ٹپکا؟" ڈوگن نے پوچھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ کوئی سکینڈل معلوم ہوتا ہے"۔۔۔
اس نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن میں اسے ردعمل یا انتقام بھی کہوں گا۔
فرانسس خشک طبع اور بے ہودہ آدمی ہے۔ اس نے میرا کیس تو
دفتر میں ہی ختم کرا دیا تھا اور مجھے قرض بھی بخش دیا تھا۔ اس کے بعد
میری بیٹی نے اس کے ساتھ شادی کر لی مگر اس نے میری بیٹی کی
قدر نہ کی۔ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا رہا۔ اسے شاید یہ احساس تھا

کہ وہ بوڑھا اور بھدا ہے اور لڑکی جوان اور خوبصورت ہے اس لئے
لڑکی اُس کی وفادار نہیں ہو سکتی۔ وہ لڑکی پر بے بُنیاد الزام تھوپتا رہتا
تھا میرا خیال ہے کہ لڑکی نے انتقاماً اپنے جذبات کو مارنے کی بجائے
ان کی تسکین کا در پردہ انتظام کر لیا تھا۔"

"آپ کو کبھی پتہ چلا تھا کہ مقتولہ اُس مسلمان سے ملتی ملاتی تھی یا قطع
تعلق کر لیا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "بہر حال میں وثوق سے
کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ہم نے مقتولہ کی چھوٹی بہن سے اور ماں سے بھی پوچھا کہ وہ
اُس مسلمان کو جانتی ہیں جسے مقتولہ چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں....
ہم وہاں سے آئے تو میرے ذہن میں اس معمّے کا جو حل آرہا تھا وہ
یُوں تھا کہ لڑکی نے اس مسلمان امیر زادے کو مایوس کیا اور فرانسس
جیسے بھدے آدمی کے ساتھ شادی کر لی، پھر رابرٹ کے ساتھ دوستانہ
کر لیا۔ مسلمان کو پتہ چل گیا اور اُس نے دونوں کو قتل کرا دیا۔ ہو سکتا ہے
مقتولہ نے اُسے بتایا ہو کہ اُس نے فرانسس کے ساتھ اپنے باپ
کو مصیبت سے نجات دلانے کے لئے شادی کی ہے۔ مسلمان نے
یہ صورت قبول کر لی ہو گی لیکن میل ملاقات جاری رہا ہو گا مگر رابرٹ
کے ساتھ تعلقات اس شخص کے لئے ناقابلِ برداشت ہوں گے۔

ڈوبگن نے بھی یہی سوچا تھا لیکن وہ فرانسس کو نظر انداز نہیں کر

رہا تھا۔ مجھے اس سے پُورا اتفاق تھا۔ اب تو پادری نے اور مقتولہ
کے باپ نے بھی بتا دیا تھا کہ فرانسس مزاج کا بہت بُرا آدمی تھا۔ پولیس
کی نگاہ میں اُس میں قتل کرنے یا کرانے کا مادہ موجود تھا۔ وہ اپنے
مکان میں نظر بند تھا۔ تفتیش کے دوران ہم ایک ہی بار اُس کے پاس
گئے تھے اور اُسے اقبالِ جُرم کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی
تھی۔ اُسے سزا سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ اُسے یہ بھی کہا تھا کہ
وہ کرائے کے قاتلوں کو پکڑوا دے اور ہم اُسے الزام سے بری کرا
دیں گے لیکن وہ غصّے میں تھا۔ مجھے یہ شک بھی ہوتا تھا کہ یہ شخص
بہت چالاک ہے اور یہ بھی کہ اسے توقع ہے کہ اس کا سرکاری رتبہ
اسے پولیس کے جال سے نکال لے گا۔ اس نے سب انسپکٹر ٹھگ موہن
سنگھ کو رشوت دے کر اپنے آپ کو تفتیش سے خارج کرا یا بلکہ ساری
تفتیش خراب کرا دی تھی۔ اس کا یہ اقدام اس کے خلاف ہمارے
شک کو یقین میں بدل رہا تھا۔

ہم رابرٹ کے گھر گئے۔ رابرٹ جوانی میں قتل ہو گیا تھا۔ اُس
کا باپ ہمیں دیکھتے ہی واہی تباہی بکنے لگا۔ دراصل اُس کی کوششوں
سے تفتیش تھانے سے نکلوا کر ہمیں دی گئی تھی۔ اُس نے پہلے تو
مقتولہ کے باپ کو بُرا بھلا کہا۔ وہ کہتا تھا کہ باپ شرابی اور جواری ہے
اُس نے روپے پیسے کے لالچ میں لڑکی فرانسس جیسے جنگلی بھینسے
کو دے دی۔ لڑکیاں بدچلن ہیں۔ اس لڑکی نے ہمارے بیٹے کو

پھانس لیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک مسلمان ٹھیکیدار کو پھانس رکھا تھا۔ فرانسس کو پتہ چلا تو اُس نے بیوی کو طلاق دینے کی بجائے اُسے اور ہمارے بیٹے کو قتل کرا دیا۔ اُس نے پسماندہ اور گنوار ہندوستانیوں والی حرکت کی۔

"لیکن آپ کا بیٹا فرانسس کی غیر حاضری میں رات کو اُس کے بیڈ روم میں کیا کر رہا تھا؟"

"وہ لڑکی بدمعاش تھی" — باپ نے کہا — "لڑکی نے بلایا ہو گا۔"

اس سے ہم نے جو کچھ بھی پوچھا اس نے اُلٹا اور بے معنی جواب دیا۔ یہ بھی پوچھا کہ وہ مسلمان کون ہے۔ اسے بھی اُس کا نام وغیرہ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے اسے کہا کہ ہم رابرٹ کی بیوی کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے اس لڑکی کو ہمارے پاس بھیج دیا۔

اس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔ خاص طور پر خوبصورت نہیں تھی۔ وہ اداس تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تک نہیں تھی۔ ہونی بھی نہیں چاہیئے تھی۔ وہ ہندو نہیں تھی کہ ساری عمر اُسے بیوگی میں کاٹنی تھی، اور مسلمانوں والی برادری کی پابندیوں سے بھی آزاد تھی۔ وہ دوسری شادی کی سوچ رہی ہو گی۔

"اس واردات کے متعلق کچھ بتا سکتی ہو؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"میں کوئی نئی بات نہیں بتا سکتی" — اس نے جواب دیا — "آپ کو معلوم ہے، سب کو معلوم ہے کہ رابرٹ فرانسس کے بیڈ روم میں اُس

کی بیوی کے ساتھ قتل ہوا ہے۔ اُسے قتل ہونا ہی تھا۔ اگر قتل نہ ہوتا تو یا فرانسس اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا یا میں رابرٹ سے طلاق لے لیتی۔ کچھ تو انجام ہونا ہی تھا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ رابرٹ مقتولہ میں دلچسپی لیتا ہے؟"

"مجھے معلوم ہو گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اس کی دلچسپی مجھ سے ہٹ کر اُدھر منتقل ہو گئی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتولہ کا چال چلن اچھا نہیں تھا۔"

"شادی سے پہلے اچھا تھا" — اس نے جواب دیا — "فرانسس کے قبضے میں آ کر وہ بگڑ گئی۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ بات کر رہی ہو" — میں نے کہا — "کیا تم نے سُنی سنائی پر یقین کر لیا ہے؟"

"نہیں" — وہ بولی — "وہ میری کلاس فیلو تھی۔ ہم ہمراز سہیلیاں تھیں۔ اس کے والدین کا گھر ہمارے گھر سے دُور تھا پھر بھی ہم سکول کے بعد ملتی ملاتی اور بہت دیر اکٹھی رہتی تھیں۔"

"اگر تم اس کی ہمراز ہو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ کسی مسلمان امیر زادے کو چاہتی تھی۔"

"اچھی طرح جانتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "میں رابرٹ کو چاہتی تھی۔ اُس کی باتیں میں اُسے (مقتولہ کو) سنایا کرتی تھی اور وہ اپنے چاہنے والے کی بڑی اچھی اچھی باتیں مجھے سُنایا کرتی تھی۔"

"تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"ان کے ساتھ گھومی پھری بھی ہوں" — اس نے جواب دیا — "تین چار بار کیناٹ پلیس کے ایک ریسٹورانٹ میں ان کے ساتھ کھایا پیا بھی ہے۔"

"اُس کا اتا پتہ؟"

اُسے اتا پتہ معلوم نہیں تھا۔ [illegible] سلیمان تھا۔ اُس نے بتایا کہ تین چار بار وہ بھی مقتولہ کے ساتھ سلیمان سے ملنے گئی ہے۔ کیناٹ پلیس میں ایک ریسٹورنٹ تھا (مجھے نام یاد نہیں رہا) سلیمان ہمیشہ وہیں انتظار کیا کرتا تھا۔ چھوٹا سا یہ ریسٹورنٹ اُونچے درجے کے لوگوں کے لئے تھا۔

ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ سلیمان کے گھر کا پتہ چلے۔ ہم نے رابرٹ کی بیوی کو کریدنا شروع کیا تو اُس نے بتایا کہ وہ جتنی بار وہاں گئی ہے، کیبن میں بیٹھی ہے اور ہر بار ایک ہی بیرہ کھانے پینے کی چیزیں لاتا تھا۔ سلیمان اُسے ٹپ زیادہ دیتا تھا۔ اُس بیرے کے ساتھ سلیمان بے تکلفی سے باتیں کرتا تھا۔

"تم مقتولہ کی شادی سے پہلے کی باتیں کر رہی ہو" — ڈوبگن نے پوچھا — "شادی کے بعد بھی وہ سلیمان سے ملتی رہی تھی؟"

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "چھ سات مہینے گزرے مقتولہ مجھے اسی ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ سلیمان وہاں انتظار میں بیٹھا تھا۔ مقتولہ نے مجھے بتایا تھا کہ فرانسس کے ساتھ شادی کرنے کے بعد وہ پہلے کی طرح سلیمان سے ملتی رہتی تھی۔ اُس نے سلیمان کو بتا دیا تھا کہ اُس

نے باپ کی خاطر شادی کی ہے اور یہ ایک قربانی ہے۔ اس نے مجھے بھی بتایا تھا کہ اپنے باپ کے لئے اور اپنی بہنوں کے مستقبل کے لئے اُس نے اپنے جذبات اور اپنی محبت کو قربان کر دیا ہے۔ وہ میرے ساتھ باتیں کرتے رویا کرتی تھی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ سلیمان اُسے کہیں بھاگ چلنے کو کہہ رہا ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ فرانسس کو قتل کرنے کے لئے بھی تیار تھا، لیکن مقتولہ نے اُسے روک دیا تھا۔ کہتی تھی کہ فرانسس کی موت کا اُسے کوئی افسوس نہیں ہوگا لیکن سلیمان پکڑا جائے گا اور اُسے سزائے موت ہو جائے گی۔ وہ کہتی تھی کہ میں اپنی محبت کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔"

"سلیمان کے ساتھ ملاقاتیں قتل تک چلتی رہی ہوں گی" — میں نے کہا۔

"اُس کے قتل سے چھ سات ماہ پہلے تک تو مجھے معلوم ہے کہ وہ سلیمان سے ملتی رہی" — اُس نے کہا — "میں آخری بار اُس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چھ سات ماہ پہلے گئی تھی۔ اس کے بعد میرا اور مقتولہ کا تعلق ٹوٹ گیا تھا۔"

"فرانسس نے اُسے باہر جانے سے روک دیا ہوگا" — ڈوبگن نے کہا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اُس سے ملنا چھوڑ دیا

تھا۔ وجہ یہ ہوئی کہ وہ شادی سے پہلے کی طرح بعد میں بھی میرے گھر آیا کرتی تھی۔ رابرٹ کے ساتھ میری شادی مقتولہ کی شادی سے ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ یہ تو میں دیکھ رہی تھی کہ رابرٹ مقتولہ کے ساتھ بے تکلف تھا لیکن یہ کوئی بُری بات نہیں تھی۔ میں نے قتل سے چھ ماہ پہلے دیکھا کہ رابرٹ اور مقتولہ اُس حد تک بے تکلف ہو چکے ہیں جسے کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے باہر سے پتہ چلا کہ رابرٹ مقتولہ کے گھر اُس وقت جاتا ہے جب فرانسس گھر نہیں ہوتا۔ رابرٹ میرے ساتھ کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔ ایک بار ایک پارٹی میں فرانسس اور رابرٹ کی لڑائی بھی ہو گئی تھی۔ فرانسس غصے سے چلا گیا لیکن مقتولہ پارٹی میں رہی اور رابرٹ کے ساتھ ناچتی رہی۔"

اس لڑکی نے بہت سی باتیں سنائیں۔ ان تفصیلات سے ہم نے یہ اخذ کیا کہ مقتولہ سلیمان سے بھی ملتی تھی اور اُس نے رابرٹ کو بھی پھانس لیا تھا۔ اب ہماری دلچسپی سلیمان کے ساتھ تھی۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ لڑکی (رابرٹ کی بیوی) قتل کرانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ ہم پھر سلیمان پر آ گئے اور پوچھا کہ سلیمان مقتولہ کے گھر میں کبھی گیا تھا؟

"کبھی ذکر نہیں ہوا۔" اُس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اُسے مقتولہ کے گھر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کا اپنا بڑا خوبصورت تانگہ ہے۔ ریسٹورنٹ سے میں گھر آ جاتی اور سلیمان مقتولہ کو اپنے تانگے میں کہیں لے جاتا تھا۔"

تانگے کے نام پر ہم چونکے۔ ڈوگن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"سلیمان ہمارا آدمی ہے۔"

میں ایک بار پھر بتا دوں کہ اُس دَور میں اپنے تانگے کی حیثیت اپنی کار جیسی ہوتی تھی۔ وہ زمانہ کاروں کا نہیں تھا۔ ہم نے تانگے اور گھوڑے کے متعلق اُس سے چند ایک باتیں پوچھیں اور اُسے کہا۔ "تم ہماری مدد کر سکتی ہو۔ ہمیں قاتل کو پکڑنا ہے۔ تم اُسی ریسٹورنٹ میں جاؤ اور اُس بیرے سے کہو کہ تم سلیمان سے ملنے آئی ہو، اُس کا گھر کا پتہ بتاؤ۔ اگر اُسے معلوم نہ ہو تو وہاں ہر شام جاؤ۔ شاید سلیمان تمہیں مل جائے۔ کسی طرح اُس کے گھر کا پتہ معلوم کرو۔"

ہم خود ریسٹورنٹ میں جا سکتے تھے لیکن بیرا ہمیں مشکوک آدمی سمجھ کر ٹال سکتا تھا۔ رابرٹ کی بیوی ہماری مدد کے لئے تیار ہو گئی۔

اس کے بعد ہم کلب اور ہر اُس جگہ جہاں یہ لوگ تفریح وغیرہ کے لئے جمع ہوتے تھے، مختلف لوگوں سے ملتے اور معلومات لیتے رہے۔ ایک آدمی نے جو کلب کو کچھ اشیاء سپلائی کرتا تھا، سلیمان کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ اس آدمی کو ہم نے یہ پتہ نہ چلنے دیا کہ ہم پولیس کے آدمی ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو سلیمان کے دوست ظاہر کیا تھا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ بہت بڑے ٹھیکیدار کا بیٹا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ باپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ خوبصورت جوان ہے۔ باپ کی جائیداد خاصی تھی۔ اس خاندان نے انگریزوں کی بہت خدمت کی تھی۔

ڈوبگن نے کہا کہ سلیمان ہمارا ملزم نہیں۔ اُسے صرف شاملِ تفتیش کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ وہ مقتولہ کے ساتھ دوستی سے صاف انکار کر سکتا تھا۔ اس کے خلاف تھوڑی سی شہادت کی ضرورت تھی۔ یہ تو ہمارا شک تھا کہ مقتولہ اور مقتول کو اسی نے قتل کرایا ہوگا۔ اب تانگے نے شک کو ذرا تقویت دے دی تھی لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ مجھے یہ شک تھا کہ سلیمان فرانسس کی غیر حاضری میں مقتولہ کے گھر جاتا ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو یہ ضرور ہوگا کہ وہ کبھی تو رات کو اپنے تانگے میں مقتولہ کو گھر تک چھوڑ گیا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو دوسرے بنگلوں والوں میں سے کسی نے دیکھا ہوگا یا چوکیدار نے دیکھا ہوگا۔ بہرحال یہ اندھیرے میں بھٹکنے والی بات تھی۔ تفتیش بھٹک بھٹک کر ہی کی جاتی ہے۔

مجھے گورکھے چوکیدار کا خیال آیا۔ نیپالی گورکھوں میں آج بھی یہ وصف موجود ہے کہ ڈیوٹی کے پکے اور دیانتدار اور سچ بولنے والے لوگ ہیں۔ اتنی وفادار قوم شاید دنیا بھر میں اور کوئی نہیں۔ ہم نے گورکھے چوکیدار کو اپنے ہیڈکوارٹر میں بلایا۔ اُسے تانگے کا رنگ، ساخت اور گھوڑے کا رنگ بتا کر پوچھا کہ کبھی رات کو اُس نے یہ تانگہ اپنے علاقے میں آتا جاتا دیکھا ہے؟ — اُس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اُس سے ہم اِدھر اُدھر کی معلومات لیتے رہے جو برائے نام تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔

تفتیش چونکہ قتل کی ہو رہی تھی اس لئے گورکھا ہم پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ اُس کی کوتاہی کا نتیجہ نہیں۔ اُس نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے کہا — "مجھے افسوس ہے کہ دوسرے چوکیدار نے اُس رات مجھے چھٹی کرا دی تھی، ورنہ قاتل نکل کر نہ جاتے۔ میں نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔"

مجھے مسلمان چوکیدار کا بیان یاد آ گیا۔ میں نے سوچا کہ گورکھے سے اس کے بیان کی تصدیق یا تردید کرا لی جائے۔ گورکھے کے اِن الفاظ نے کہ دوسرے چوکیدار نے اُس رات مجھے چھٹی کرا دی تھی، مجھے شک میں ڈال دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اُن دنوں بیمار ہو گئے تھے اس لئے اُس نے تمہیں چھٹی کرائی تھی۔

"بیمار؟ .... کون میں؟" — اُس نے حیرت سے کہا — "میں کبھی بیمار نہیں ہوا۔"

"پھر چھٹی کیوں کی تھی؟"

"اُس نے کہا تھا کہ ہم نے کبھی چھٹی نہیں کی" — گورکھے نے کہا — "مہینے میں ایک رات تم چھٹی کر لیا کرو، میں تمہارا علاقہ سنبھال لیا کروں گا، اور ایک رات میں چھٹی کر لیا کروں گا۔ اُس نے مجھے کہا کہ تم کل رات چھٹی کرو۔"

"تم کب سے یہاں چوکیداری کر رہے ہو؟" — میں نے پوچھا — "اور وہ کب سے ہے؟"

"کوئی تین سال ہو گئے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "اور وہ مجھ سے پہلے کا ہے۔ ہمیں تنخواہ بنگلوں کے صاحب لوگ دیتے ہیں۔"

ہم اردو میں باتیں کر رہے تھے جو ڈوبگن اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے گورکھے کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ ہم نے اس پہ غور کیا کہ مسلمان چوکیدار نے کہا تھا کہ گورکھا بیمار تھا۔ اُس نے گورکھے کو اُس رات چھٹی کرائی جس رات قتل کی واردات ہوئی۔ جائے واردات پہ تانگہ آیا تھا۔ مقتول کے چاہنے والے کے پاس اپنا تانگہ ہے۔ ہم نے گورکھے کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھیج دیا کہ مسلمان چوکیدار کو ابھی ساتھ لے آؤ۔ گورکھے کو معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

وہ کوئی دو گھنٹے بعد آیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اب جھوٹ بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم سیدھے پھانسی کے تختے پر جا رہے ہو۔ میں نے اُسے سلیمان کے تانگے کا رنگ، ساخت اور گھوڑے کا رنگ بتا کر کہا — "قتل کی رات یہی تانگہ تم نے دیکھا تھا؟" — اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں جان گیا کہ وہ اندر سے ہل گیا ہے۔ میں نے اُس کا جواب سُنے بغیر کہا — "سلیمان خود ساتھ تھا؟" — اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں — "اور تم قریب ہی کھڑے تھے۔"

"حضور والا!" — اُس کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا۔

ڈوبگن نے کوئی سوال کیا تو میں نے ڈوبگن کو انگریزی میں کہا — "اب آپ چُپ رہیں۔ آپ کی نسل نے ہماری بڑی اچھی راہنمائی کی ہے۔

یہ میری نسل ہے یہ میں جانتا ہوں کہ اس سے کس طرح راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میز پہ ڈوبگن کا بید کا ڈنڈا رکھا تھا جو کوئی دو فٹ لمبا اور ایک انچ موٹا تھا۔ وہ یہ ڈنڈا ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا تھا۔ یہ اُس دور کا رواج تھا۔ میں نے ڈنڈا پکڑ کر چوکیدار کے سامنے میز پر اتنی زور سے مارا کہ چھوٹے سے بند کمرے میں بڑا بلند دھماکہ ہوا۔ چوکیدار بُری طرح بدکا۔ ڈوبگن بھی بدک گیا۔ میں نے چوکیدار سے کہا — "تم نے کہا تھا کہ گورکھا بیمار تھا اس لئے اُسے چھٹی کرائی تھی لیکن تم نے قتل کی واردات کرانے کے لئے اُسے چھٹی کرائی تھی" — اُس کے مُنہ سے ایک بار پھر نکلا — "حضور والا" — میں نے ڈنڈا اُس کے کندھے پر رکھ کر کہا — "فوراً اقبالی ہو جاؤ۔ وعدہ معاف گواہ بن جاؤ..... جانتے ہو وعدہ معاف گواہ کیا ہوتا ہے؟" — وہ جانتا تھا..... میں نے کہا — "ہمارے پاس پورا ثبوت آگیا ہے۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ اپنے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں نہ ڈالو..... فوراً بولو، کتنا انعام ملا تھا؟"

وہ کچھ دیر چُپ رہا۔ ہم بھی چُپ رہے۔ اُس نے سر اُٹھایا اور آہستہ سے بولا — "حکم بجالاؤں گا سرکار! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"میں انہیں یتیم نہیں ہونے دوں گا" — میں نے کہا — "اُن کی قسمت تمہارے ہاتھ میں ہے" — میں کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا اور اُسے کہا — "بولو..... میں نے اتنا انعام لے کر یہ واردات کرائی ہے۔"

"میں نے اڑھائی سو روپیہ لے کر یہ واردات کرائی ہے" — اُس نے بچے جموُرے کی طرح کہا۔

"شاباش!" — میں نے کہا — "اب تمہارے بچے یتیم نہیں ہوں گے۔"

اور اُس نے اقبالی بیان لکھوا دیا جو مختصراً یوں تھا کہ ایک آدمی اُس کے پاس آیا تھا اور یہ کہہ کر اُسے سلیمان کے پاس لے گیا تھا کہ ایک کام ہے اور اُجرت بہت ملے گی۔ چوکیدار سلیمان سے ملا اور اُس کی امارت سے بہت مرعوب ہوُا۔ سلیمان خوبصورت اور شگفتہ جوان تھا۔ اُس نے چوکیدار کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اُسے نہایت اعلیٰ کھانا کھلایا۔ دس روپے بھی دیئے جو آج کے ایک سو روپے کے برابر تھے۔ اُسے کام یہ بتایا کہ فرانسس کے بنگلے میں واردات کرنی ہے اور چوکیدار رکاوٹ بننے کی بجائے راستہ صاف کرے۔ اسے یہ نہیں بتایا گیا کہ واردات قتل کی ہو گی۔ سلیمان نے اُسے اڑھائی سو روپیہ پیش کیا۔ چوکیدار نے اتنی رقم کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رقم کے علاوہ اُسے ایسا گھیرا گیا کہ وہ رضامند ہو گیا۔

اُس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ فرانسس دَورے پر جائے گا تو رات کو رابرٹ فرانسس کے گھر آئے گا۔ اس کی اطلاع ایک آدمی کو دینی ہو گی جو بنگلوں سے دُور ایک جگہ کھڑا ہو گا۔ پھر دو تین آدمی بنگلے کے اندر جائیں گے۔ سلیمان کا تانگہ آئے گا۔ یہ آدمی تانگے میں سوار ہو کر چلے جائیں گے۔ چوکیدار کو بتا دیا جائے گا کہ فرانسس کب دَورے پر جائے گا۔ یہ پروگرام جس طرح

سوچا گیا تھا اسی طرح اس پر عمل ہو گیا۔ چوکیدار کو ایک آدمی نے بتایا کہ کل صبح فرانسس دَورے پر جا رہا ہے۔ لہٰذا چوکیدار اگلی رات ہوشیار رہے۔ چوکیدار نے مزید پیش بندی اپنے طور پر یہ کی کہ گورکھے کو اگلی رات چھٹی کرا دی۔ اگلی ہی رات رابرٹ کا فرانسس کے گھر آنا ضروری نہیں تھا لیکن چوکیدار اسے طے سمجھتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

موت رابرٹ کو اُسی رات لے آئی۔ چوکیدار نے آدھی رات سے پہلے ایک آدمی کو فرانسس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ وہ رابرٹ صاحب کو تو پہچانتا ہی نہیں۔ اُس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ فرانسس نہیں۔ چوکیدار اُس جگہ گیا جہاں اُسے بتایا گیا تھا کہ ایک آدمی کھڑا ہو گا۔ وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ چوکیدار نے اُسے بتایا کہ ایک آدمی فرانسس کے بنگلے میں چلا گیا ہے۔ اس آدمی نے چوکیدار سے کہا وہ بنگلے کے قریب چلا جائے اور ہدایت کے مطابق اِدھر اُدھر خیال رکھے۔

تین آدمی آئے اور پھاٹک سے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بنگلے کے پیچھے ایک تانگہ آیا۔ چوکیدار اُدھر گیا۔ بنگلے سے تینوں آدمی نکلے۔ انہوں نے دیوار پھلانگی اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگے میں سلیمان بھی تھا۔ اُس نے اڑھائی سو روپیہ چوکیدار کو دیا۔ اتنے میں ساتھ والے بنگلے کا کتا بھونکا۔ تانگہ چلا گیا۔ اِس بنگلے کا صاحب باہر آیا۔ چوکیدار کو آواز دی اور پوچھا کہ تانگے میں کون تھا۔ چوکیدار نے جھوٹ بول دیا۔ چوکیدار کو دوسرے دن پتہ چلا کہ فرانسس کی بیوی اور رابرٹ قتل ہو گئے ہیں۔ چوکیدار بہت ڈرا

لیکن سلیمان نے اسے دوسرے دن بلا کر کھلایا پلایا بھی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔

چوکیدار ان تینوں میں ۔ سے جو اندر گئے تھے، صرف ایک کو پہچانتا تھا۔ یہ پٹھان تھا۔ اُس نے اس کی نشاندہی کر دی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے بھی وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ دیا گیا۔ اسے یہ بھی کہا گیا کہ اُس کے ساتھی پکڑے گئے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو وعدہ معاف گواہ بنانا ہے۔ جو کوئی صحیح اور زیادہ باتیں بتائے گا اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا۔ یہ شخص بھی اقبالی ہو گیا اور اُس نے دوسرے دو ساتھیوں کی نشاندہی کر دی۔ انہیں رات کے وقت گھروں سے گرفتار کیا گیا۔ ان میں ایک دِلّی کا بدمعاش تھا اور تیسرا بڑے اچھے اور امیر گھرانے کا نوجوان تھا جو سلیمان کا گہرا دوست تھا۔ اس سے اگلے روز علی الصبح سلیمان کے گھر چھاپہ مار کر اُسے گرفتار کیا گیا۔ اُس کا تانگہ اور گھوڑا بھی قبضے میں لے لیا گیا۔ سلیمان کے سوا سب نے اقبالِ جرم کر لیا۔ ان میں سے ہر ایک وعدہ معاف گواہ بننا چاہتا تھا اور میں اس کے حق میں تھا کہ کسی ایک کو اپنا گواہ بنا لیا جائے کیونکہ خطرہ تھا کہ تینوں عدالت میں جا کر اپنے اقبالی بیانات سے منحرف ہو جائیں گے، لیکن ڈوبگن نے مجسٹریٹ سے سب کے بیان قلم بند کرا لئے وعدہ معاف گواہ کسی کو نہ بنایا۔

سلیمان صرف امیر زادہ نہیں شہزادہ تھا۔ اُسے بیان دینے کو کہا گیا لیکن اُس نے ہمیں انگریزی زبان میں دھتکار دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ

تمہارے کرائے کے قاتل اقبالِ جرم کر چکے ہیں۔ اُس نے کہا ”سب بکواس کرتے ہیں“۔ ہم نے اس سے پھر کچھ بھی نہ پوچھا۔

اس کے امیر دوست نے بتایا کہ سلیمان مقتولہ کو چاہتا تھا اور ان کی محبت پاک تھی۔ سلیمان نے اُسے بتایا تھا کہ وہ لڑکی کو نکال لائے گا اور اُسے مسلمان کرے گا۔ لڑکی اُسے عیسائی ہونے کو کہتی تھی۔ محبت اتنی گہری تھی کہ وہ ایک دوسرے سے دُور بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ آخر لڑکی کی شادی فرانسس سے ہو گئی۔ وہ سلیمان سے ملی۔ بہت روئی اور بتایا کہ اُس نے باپ اور بہنوں کی خاطر مجبور ہو کر شادی کی ہے۔ سلیمان اُسے کہتا تھا کہ اُس نے اس لئے سلیمان کو ٹھکرایا ہے کہ اُس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لڑکی نے اسے یقین دلا دیا کہ یہ بات غلط ہے۔

لڑکی اُسے ملتی رہی۔ سلیمان نے اُسے کہا کہ وہ فرانسس کو مروا دے گا اور لڑکی اُس کے پاس آ جائے۔ لڑکی نے کہا کہ فرانسس کی موت سے وہ بہت خوش ہو گی لیکن سلیمان پکڑا جائے گا جو وہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ سلیمان نے قسم کھائی کہ وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ ایک سال بعد مقتولہ کا رویّہ بدلنے لگا۔ سلیمان سے کم ملتی تھی۔ ایک روز سلیمان نے بتایا کہ لڑکی رابرٹ نام کے ایک آدمی سے ملتی ملاتی ہے۔ سلیمان کے اس دوست کو تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ سلیمان کبھی اُداس ہو جاتا کبھی بلاوجہ غصے میں آ جاتا۔

ایک روز (قتل سے آٹھ دس روز پہلے) اُس نے اپنے اس دوست

کو بتایا کہ اُس کی محبت کا خون ہو رہا ہے۔ رابرٹ کو اور اس لڑکی کو بھی قتل کرنا ہے۔ اُس نے زیادہ تفصیلی بات نہ کی۔ اتنا ہی کہا کہ فرانسس مہینے میں تین چار روز کے لئے دَورے پر دِلّی سے باہر چلا جاتا ہے اور رابرٹ یہ راتیں فرانسس کے گھر گزارتا ہے۔ یہ مقدمے کے فیصلے تک بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ سلیمان کو یہ اطلاع کہاں سے ملی تھی اور یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ اُسے کس نے بتایا تھا کہ فرانسس فلاں روز دَورے پہ جا رہا ہے۔ اُس نے قتل کا پروگرام بنا لیا۔

یہ تفصیل بڑی لمبی ہے کہ اُس نے کرائے کے قاتلوں کو کس طرح تیار کیا اور پروگرام کس طرح طے کیا۔ مختصر یہ کہ سلیمان کے اس دوست نے سلیمان سے کہا کہ انہیں فرانسس کے گھر میں قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں الگ الگ کہیں اور قتل کیا جا سکتا ہے۔ سلیمان نے کہا کہ دونوں کو فرانسس کے گھر قتل کرنے سے کسی کو ان پر شک نہیں ہوگا۔ پولیس کو بھی یہی شک ہوگا کہ انہیں فرانسس نے قتل کرایا ہے۔

انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ رابرٹ فرانسس کی غیر حاضری کی پہلی رات ہی اُس کے گھر جائے گا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اُس رات نہ گیا تو دوسری تیسری رات ضرور جائے گا۔ لہٰذا انہیں ہر رات وہاں جانا اور چوکیدار کی اطلاع کا انتظار کرنا تھا۔ رابرٹ کی بدنصیبی کہ وہ پہلی رات ہی آ گیا۔ سلیمان کچھ عرصہ پہلے فرانسس کی غیر حاضری میں اس بنگلے میں آیا تھا۔ اُس نے اپنے کرائے کے قاتلوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ بیڈ روم کہاں ہے

تانگہ سلیمان لایا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دُور تانگے میں بیٹھا رہا۔ چوکیدار نے اطلاع دی تو سلیمان تانگے میں رہا اور اس کے تین ساتھی پیدل بنگلے تک گئے۔ پھاٹک سے اندر گئے۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ پیچھے گئے تو ایک شیشہ ٹوٹا ہُوا نظر آیا۔ ہاتھ ڈالا تو وہیں چٹخنی تھی جو کھول لی گئی۔ تینوں اندر گئے۔ اگلا دروازہ کھلا ہُوا تھا اور اِدھر روشنی تھی۔ دیکھا، ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ رابرٹ اور مقتولہ اندر ڈبل بیڈ پر سوئے ہُوئے تھے۔ پٹھان نے چاقو سے مقتولہ کا پیٹ چیر ڈالا۔ دِلّی کے بدمعاش نے دوسری طرف ہو کر رابرٹ کے سینے میں چاقو مارے۔ سلیمان کے دوست کے پاس بھی چاقو تھا۔ اُس نے دونوں پر وار کئے۔ رابرٹ اُٹھا اور فرش پر گرا۔ فرانسس کی بیوی پلنگ سے اس طرح گری کہ سَر فرش پہ لگا اور ٹانگیں پلنگ پر رہیں۔

تینوں باہر آ گئے۔ سلیمان تانگہ لے کر آ گیا تھا۔ چوکیدار اُس کے پاس کھڑا تھا۔ سلیمان نے پوچھا — "کام ہو گیا؟" — اُس کے دوست نے جواب دیا — "ہو گیا" — سلیمان نے پوچھا — "دونوں کا؟" — اسے جواب دیا گیا — "دونوں کا" — اور وہ چلے گئے۔

وہ مطمئن تھے کہ انہیں کوئی گرفتار نہیں کر سکے گا۔ سلیمان تو بہت ہی خوش تھا کہ اُس نے اپنی بھیانک واردات پوری کامیابی سے کر لی ہے اور اب پولیس اندھوں کی طرح بھٹکتی پھرے گی مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ گناہ اپنے پردے خود اُٹھا دیا کرتا ہے۔ ذرا سی غلطی پولیس کو روشنی

دکھا دیتی ہے۔

سلیمان نے مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی کہا کہ اس جُرم کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں اور سیشن کورٹ میں بھی یہی کہا لیکن اُس کے کرائے کے قاتلوں میں سے کوئی بھی اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہ ہُوا۔ ہم نے استغاثہ کی ہر کڑی نہایت خوبی سے ملائی تھی۔ تینوں قاتلوں اور سلیمان کو عمر قید دی گئی اور چوکیدار کو اعانتِ جُرم میں پانچ سال۔ ہائی کورٹ سے اپیلیں بھی مسترد ہو گئیں۔

اور وہ پاگل ہو گئی

رات دس گیارہ بجے کے درمیان سول ہسپتال سے ایک آدمی آیا۔ مجھے ڈاکٹر نے ہسپتال بلایا تھا۔ اس آدمی نے بتایا کہ زہر خورانی کا ایک کیس ہے۔ میں ہسپتال گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس کے پاس قصبے کا ایک آدمی لایا گیا جسے اچانک قے آنے لگی اور وہ بہت تلخی محسوس کرتا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے دیکھا تو اُسے زہر کی علامتیں بڑی صاف نظر آئیں۔ مریض کی حالت بہت بُری تھی۔ نیم غشی کی کیفیت تھی۔ اُس کے مُنہ سے جھاگ پھُوٹ رہی تھی۔ یہ ڈاکٹر نے محفوظ کر لی۔ ہسپتال میں آکر اس نے جو قے کی، اس کی بھی کچھ مقدار محفوظ کر لی گئی۔ مریض بول نہیں سکتا تھا۔ اپنے سینے، پیٹ اور گلے پر بے تابی سے ہاتھ پھیرتا تھا۔ اس سے ڈاکٹر نے اندازہ کیا کہ مریض تلخی محسوس کر رہا ہے۔

ڈاکٹر نے مریض کو ایک انجکشن دیا۔ وہ نزعی بیان لینا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر اُس سے پوچھتا رہا کہ اُس نے کیا کھایا ہے؟ کسی نے کچھ کھلایا ہے؟

وغیرہ مریض سرگوشی میں صرف یہ کہہ سکا — "بیوی نے دودھ پلایا تھا" — اس کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔

ڈاکٹر نے ایک اور انجکشن دیا۔ مُنہ میں دوائیاں ٹپکائیں جو حلق سے نیچے نہ جا سکیں۔ مریض مر گیا۔ مریض کے لواحقین جو اسے ہسپتال لاتے تھے باہر بیٹھے تھے۔

"مریض نے کہا تھا کہ بیوی نے دُودھ پلایا تھا" — ڈاکٹر نے مجھے بتایا — "مریض مر گیا تو میں باہر نکلا۔ اس کے لواحقین سے میں نے پوچھا کہ مریض کی بیوی کہاں ہے۔ ایک جوان لڑکی بولی — 'میں ان کی بیوی ہوں' — یہ تو مجھے یقین ہو ہی چکا تھا کہ مریض کو زہر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسے ہیضے کا مریض سمجھ کر چارپائی پر اُٹھا لاتے تھے لیکن جب اس نوجوان لڑکی نے بتایا کہ وہ مریض کی بیوی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ مریض کی عمر پچاس سال سے کچھ اُوپر تھی۔ میں اس لڑکی کو مرنے والے کی بیٹی سمجھے ہوئے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اتنے بوڑھے آدمی کی اتنی جوان بیوی اکثر قتل یا خودکشی کا باعث بنتی ہے۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ زہر کس نے دیا ہے، مجھے اس لڑکی پر شک ہے۔"

یہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ لوگوں میں یا سرکاری اہل کاروں میں فرائض کا احساس تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ مریض دراصل زہر خورانی کا شکار ہوا ہے تو اُس نے تھانے اطلاع بھجوا دی۔ اس طرح اُس نے اپنے کام میں اضافہ کر لیا تھا۔ اُسے لاش کا پوسٹمارٹم کرنا تھا، کچھ اشیاء

ماہرین کے پاس بھجوانی تھیں، پھر اُسے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ اُس کے لئے سہل راستہ یہ تھا کہ مریض کی لاش اُس کے لواحقین کے حوالے کر کے فارغ ہو جاتا لیکن اُس نے انصاف کا تقاضا پُورا کیا۔ اُس کے ساتھ میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں تفتیش سے جان چھڑانے کے لئے اُسے کہہ سکتا تھا کہ مرنے والے کے کسی رشتہ دار نے شک نہیں کیا، جانے دو ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ کیس درج کریں لیکن ہم دونوں نے کچھ اور سوچا ہی نہیں۔ میں اُسی وقت تفتیش کے لئے تیار ہوگیا۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مرنے والے کے لواحقین کو ابھی نہ بتایا جائے کہ مریض مر گیا ہے۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ دو جوان لڑکیاں تھیں۔ ہم عمر معلوم ہوتی تھیں۔ میرے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ متوفی یا مقتول کی بیوی ہے اور یہ اُس کی بیٹی ہے۔ ان کے ساتھ متوفی کے دو بیٹے تھے۔ ایک بہن سے بڑا اور دوسرا اس سے چھوٹا۔ چھوٹے کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں بیوی کو اندر لے گیا۔ اُس کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ میرے ساتھ کوئی کانسٹیبل نہیں تھا۔ میں نے ہسپتال کے کمپاؤنڈر سے کہا کہ وہ باہر جا کر مرنے والے کے لواحقین پر نظر رکھے۔ اگر ان میں سے کوئی یہاں سے جاتے تو اُسے پتہ چلے بغیر مجھے بتائے۔

"اپنے خاوند کو دُودھ تم نے پلایا تھا؟" — میں نے متوفی کی جوان بیوی سے پوچھا۔

"ہاں جی!"— اس نے حیرت سے پُوچھا— "کیا بات ہے؟ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں"— میں نے اُسے تسلّی دیتے ہُوئے کہا— "مریض کی حالت ذرا خراب ہے۔ دُودھ شاید صاف نہیں تھا۔ اس میں کوئی زہر یا کیڑا اگر پڑا ہوگا۔ اللہ کرم کرے گا۔ مریض ٹھیک ہو جائے گا..... اسے یہ تکلیف اچانک اُٹھی تھی یا پہلے بھی کوئی شکایت تھی؟"

"پہلے تو انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی"— اُس نے جواب دیا پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایک آدھ منٹ بعد بولی— "تین چار دِنوں سے کہہ رہے تھے کہ سر بوجھل رہتا ہے اور معدے میں چبھن سی ہوتی ہے۔ پرسوں شام انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چارپائی سے اُٹھے تو انہیں چکر آ گیا تھا۔"

وہ گھبرا گئی

"آج تکلیف کیسے اُٹھی؟"

"یہ رات سونے سے پہلے دُودھ پیتے ہیں"— اُس نے جواب دیا— "آج رات میں نے انہیں دُودھ دیا تو کوئی آدھے گھنٹے بعد انہوں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ معدے میں بڑی زور کا درد ہونے لگا ہے، پھر انہوں نے سینے پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے کہ جلن ہوتی ہے۔ جلن بڑھ گئی، پھر یہ تڑپنے لگے۔ ابکائیاں آنے لگیں۔ صرف ایک بار قے

ہُوئی۔ دوسری بار ہسپتال میں قے ہُوئی۔"

"گھر میں کچھ دُودھ بچا ہوگا جس میں سے تم نے اسے ڈال کر دیا تھا۔"

"دُودھ میں نے نہیں ڈالا تھا"— اس نے کہا— "ان کی بیٹی باورچی خانے سے گلاس میں ڈال کر لاتی تھی۔ دیگچی میں دُودھ ضرور بچا ہوگا"— وہ گھبراہٹ کے عالم میں بولی— "آپ یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا دُودھ میں کچھ گڑبڑ تھی؟ ..... ان کی حالت سنبھلی ہے یا نہیں؟"

"سنبھل جائے گی"— میں نے جواب دیا— "شاید دُودھ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ہر رات اِسے کون دُودھ گلاس میں ڈال کر دیتا تھا؟"

"اِن کی بیٹی"— اُس نے جواب دیا— "باورچی خانہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ دُودھ وہی دیگچی سے گلاس میں ڈالتی ہے اور اپنے ہاتھوں انہیں گلاس دیتی ہے۔"

"آج تم نے اس کی بیٹی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور اپنے ہاتھوں اسے دُودھ پلایا"— میں نے کہا— "تم نے اپنے خاوند کے سامنے کمرے میں بیٹی کے ہاتھ سے گلاس لے کر خاوند کو دیا تھا؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا— "میں ان کے کمرے سے نکلی تو ان کی بیٹی برآمدے میں گلاس ہاتھ میں اُٹھائے آ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور کمرے میں لے گئی۔"

"بیٹی وہیں سے واپس چلی گئی تھی؟"— میں نے پوچھا— "اُس نے یہ نہیں کہا کہ وہ خود اپنے باپ کو دُودھ دے گی؟"

"اُس نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا تھا" — اُس نے جواب دیا — "گلاس والا ہاتھ ایک طرف کر لیا تھا۔"

"یعنی وہ تمہیں گلاس نہیں دینا چاہتی تھی۔"

"اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔"

"تم نے اس سے پہلے بھی کبھی اس کے ہاتھ سے آج کی طرح گلاس لیا اور اپنے خاوند کو دیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "یا کبھی خود دیگچی سے دُودھ ڈال کر خاوند کو دیا تھا؟"

"کبھی نہیں۔"

"آج تم نے اس کے ہاتھ سے گلاس کیوں لیا؟"

اُس کے ہونٹ ہلے لیکن اُس نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ گھبراتی ہوئی تو پہلے ہی تھی لیکن میرے اس سوال سے اُس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ کوئی جواب ہی نہ دے سکی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا کہ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اس کی گھبراہٹ اور ہکلانے سے میں شک میں پڑ گیا۔ اُس کا یہ جواب میرے لئے بہت اہم تھا کہ اس سے پہلے اُس نے خاوند کو اپنے ہاتھوں کبھی دُودھ نہیں دیا تھا۔

کیا وہ چالاک تھی؟

"تم کمرے سے دُودھ لینے نکلی تھیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں ویسے ہی نکلی تھی۔"

"اس کے ساتھ تمہاری شادی کب ہوئی ہے؟"

"چھ مہینے سے اُوپر ہو گئے ہیں۔"

"مجھے صرف ایک بات سمجھا دو" — میں نے اُسے کہا — "چھ مہینے تم نے اپنے خاوند کو اپنے ہاتھوں دُودھ نہیں پلایا تھا۔ آج رات تمہیں کیا خیال آ گیا کہ تم نے اس کی بیٹی کے ہاتھ سے دُودھ لیا اور اپنے خاوند کو جا دیا؟"

"آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟" — اُسے ہچکی سی آئی جو شاید گھبراہٹ میں اکثر آیا کرتی ہے۔

"میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا" — میں نے کہا — "تمہارا فائدہ اس میں ہے کہ میں جو کچھ پوچھتا ہُوں وہ مجھے صحیح صحیح بتا دو ..... ظاہر ہے کہ اس بوڑھے کے ساتھ تمہاری شادی زبردستی ہُوئی ہے۔ اگر تمہارے دل میں اس کے خلاف نفرت نہیں تو تم اسے پسند بھی نہیں کرتی ہو گی ..... اس کے ساتھ چھ مہینے کیسے گزرے ہیں؟"

لڑکی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ مجھے چالاک نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چالاک ہو اور بھولی بھالی بنی ہُوئی ہو۔ بہرحال یہ ابتدا تھی۔ مجھے اس کُنبے کے ہر ایک فرد سے تعارف حاصل کرنا تھا۔ اگر یہ زہر خورانی کی ہی واردات تھی تو مجرم گھر میں ہی تھا۔ اگر دُودھ درمیان

میں نہ آجاتا تو کہا جاسکتا تھا کہ زہر گھر سے باہر دیا گیا ہے .... لڑکی نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُسے ایک بار پھر کہا ___ "تم خاوند کے ساتھ خوش نہیں ہو؟"

تین چار بار پوچھنے کے بعد اس نے کہا ___ "قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔"

"اگر یہ مرجاتے تو تمہیں افسوس تو نہیں ہوگا؟"

اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا ___ "تمہاری قسمت اسی طرح بدل سکتی ہے کہ یہ مرجاتے۔"

"زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے" ___ اُس نے مایوسی کے لہجے میں کہا اور اُس کی آہ نکل گئی۔ اُس نے ایک بار پھر پوچھا کہ میں اُس کے ساتھ اس طرح کی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے اُسے گول سا جواب دیا۔

"جب اس کی حالت بگڑنے لگی تھی تو کس نے کہا تھا کہ اسے ہسپتال لے چلتے ہیں؟" ___ میں نے پوچھا۔

"اس کا چھوٹا بیٹا گھر تھا" ___ اُس نے جواب دیا ___ "میں نے اُسے بتایا۔ وہ ہمارے کمرے میں آیا۔ اپنے باپ کو دیکھا اور اُوپر چلا گیا۔ اُوپر کی منزل میں اُس کا بڑا بھائی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ نیچے آیا۔ باپ کو دیکھ کر اُس نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ ڈاکٹر کو گھر بلاؤ۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ ہسپتال لے چلتے ہیں۔ اُس نے محلے کے دو لڑکے بلائے

اور دونوں بھائیوں اور لڑکوں نے چارپائی اُٹھائی اور ہسپتال لے آئے۔"

"تم نے کوئی مشورہ نہیں دیا تھا کہ ڈاکٹر کو گھر بلاؤ یا ہسپتال لے چلو؟"

"ان کے دونوں بیٹے آگئے تو میں نے کچھ بھی نہ کہا" ___ اُس نے جواب دیا۔

بوڑھے کی جوان بیوی، جوان بیٹے

ڈاکٹر نے مجھے اندر بلایا اور کہا کہ وہ اسی وقت پوسٹ مارٹم کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں اُس کی رپورٹ پر ایف۔آئی۔آر اور دیگر کاغذات تیار کرلوں۔ میں نے مقتول کی بیوی، اس کی بیٹی اور دونوں بیٹوں کو ساتھ لیا اور تھانے کو چل پڑا۔ مقتول کے بیٹوں نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ میں انہیں کہاں لیے جارہا ہوں۔ میں انہیں ٹالتا رہا اور ہم تھانے پہنچ گئے۔ محرّر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ کاغذی کارروائی پوری کرے۔ میں نے کانسٹیبل ساتھ لئے۔ مقتول کے چاروں لواحقین کو ساتھ لیا اور اُن کے گھر چلا گیا۔ ان سے کہا کہ ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔

میں سب سے پہلے مقتول کے کمرے میں گیا۔ دُودھ کا گلاس تپائی پر رکھا تھا۔ اس میں تین چار قطرے دُودھ پڑا تھا۔ میں نے محلے

سے دو شیشیوں کا انتظام کر کے دُودھ کا گلاس قبضے میں لیا۔ باورچی خانے میں سے دُودھ کی دیگچی اُٹھائی۔ اس میں تقریباً تین پاؤ دُودھ تھا۔ یہ بھی قبضے میں لی اور میں تھانے چلا گیا۔ ان چاروں کو ساتھ لے گیا۔ یہ مسلمان گھرانہ تھا۔ اس کی دو جوان لڑکیوں ذہن میں ساتھ لیے پھر رہا تھا لیکن میری ڈیوٹی ایسی تھی کہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بڑھاپے میں جوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے والا تو اس دُنیا سے اُٹھ گیا تھا۔ اگر مجرم اس کی جوان بیوی تھی تو اس کی جوان بیٹی بے گناہ پولیس کے چکر میں آگئی تھی۔

بڑے بھائی کو اپنے دفتر میں بٹھا کر میں نے اُسے بتایا کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ بڑے بھائی کا ردِعمل یہ تھا کہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ یکلخت اُٹھا اور دروازے میں جا کر آواز دی ــــ "بشیرے! او تے اِدھر آ" ــــ میں اُسے روک نہ سکا۔ اس کا چھوٹا بھائی آگیا۔ بڑے بھائی نے اُسے کہا ــــ "ابّا جان مر گئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں انہیں زہر دیا گیا ہے۔"

چھوٹا بھائی جس کا نام بشیر تھا میرے مُنہ کو دیکھنے لگا اور آہستہ آہستہ میرے قریب آکر بولا ــــ "کیا یہ سچ ہے جناب؟"

"سو فیصد سچ ہے" ــــ میں نے کہا۔

اُس نے اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ اُس کے بھائی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ بشیر نے اُسے کہا ــــ "کیوں بھائی! میں نے ابّا جان

کو دوسری شادی سے روکا نہیں تھا؟ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ زہر اس لڑکی نے دیا ہے" ــــ اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ــــ "اگر آپ ثابت کر دیں کہ زہر اس حرامزادی نے دیا ہے تو یہ میرے ہاتھوں مرے گی۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرے ہاتھوں مرے گی۔"

میں نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ زہر اگر اس لڑکی نے دیا ہے تو مجھے اُس آدمی کی تلاش ہو گی جس کی خاطر اس نے تمہارے باپ کو زہر دیا ہے۔ یہ اکیلی ایسی جرأت نہیں کر سکتی۔ میں تم سے جو پوچھوں وہ مجھے صحیح صحیح بتا دو اور جو کچھ تم دونوں جانتے ہو وہ بھی بتا دو۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ اپنی بہن اور سوتیلی ماں کو پتہ نہ چلنے دیں کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ میں نے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے کو باہر بھیج دیا۔

بے شک پہلا شک بیوی پر ہی تھا لیکن اُسے ہی مجرم تسلیم کر لینا عقلمندی نہیں تھی۔ میرا دھیان فوراً اس طرف آیا کہ اس گھر میں دو جوان آدمی ہیں۔ بشیر کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور اس کا بڑا بھائی تیس سال سے کچھ کم تھا، اور ان کی سوتیلی ماں جوان تھی۔ اس میں دلکشی بھی تھی۔ قارئین کے لیے یہ پہلو شاید ناقابلِ یقین ہو لیکن پولیس کی نظروں میں یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ بوڑھے باپ کی جوان بیوی کو جوان بیٹا لے اُڑا، یا باپ کو ہی صاف کر دیا۔ بڑا بھائی شادی شدہ تھا لیکن شادی اچھے چال چلن کا سرٹیفیکیٹ نہیں ہوتی۔

ایک پہلو اور بھی تھا۔ بوڑھے کے قتل کا باعث جائیداد بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے حصہ دار یہ دو بھائی تھے۔ بوڑھوں کی جوان بیویاں عموماً یہ سوچا کرتی ہیں کہ اس بوڑھے نے زندگی تو اجیرن بنا دی ہے، اس کی جائیداد پہ قبضہ کرو۔ اس واردات میں بھی جائیداد کا دخل ہو سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ دوسری بیوی نے بوڑھے سے جائیداد لکھوالی ہو اور اُس کے بیٹوں میں سے کسی نے بوڑھے کو زہر دے دیا ہو۔ یہ میرے ذہن میں تھا کہ مقتول کو دُودھ دوسری بیوی نے دیا ہے لیکن مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس میں زہر کس نے ڈالا اور دُودھ کا گلاس بوڑھے تک پہنچتے کن مراحل سے گزرا ہے۔ کیا دیگچی میں زہر ملایا گیا تھا یا صرف گلاس میں؟

کنواری بہن کی قربانی

مقتول کی بیٹی کے متعلق میں نے سوچا کہ آیا وہ زہر دے سکتی ہے؟ اگر دے سکتی ہے تو وجہ کیا ہو گی؟ مجھے جواب نفی میں مل رہا تھا۔ بیٹی اگر زہر پلاتی تو سوتیلی ماں کو پلاتی۔ یہ قدرتی امر ہے کہ بیٹیاں باپوں کے لئے جان دے سکتی ہیں جان لیا نہیں کرتیں۔ تاہم اس گھر میں بیٹی بھی ایک اہم فرد تھی۔ مجھے اپنے مخبروں سے ان سب کے متعلق معلومات لینی تھیں جو دوسرے دن مل سکتی تھیں۔ میرے سامنے مقتول کا

چھوٹا بیٹا بیٹھا تھا۔ کچھ باتیں اس نے خود بتائیں، اور باقی میرے سوالوں اور جرح سے سامنے آئیں۔

اس کے مطابق اس گھر کے حالات یہ تھے کہ اُس کی بہن رشیدہ کی عمر تیس سال ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ رشتوں کی کمی نہیں تھی لیکن لڑکی کوئی بھی رشتہ قبول نہیں کرتی تھی۔ بشیر نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اُس کی ماں سات آٹھ سال ہوئے مر گئی تھی۔ رشیدہ کو اپنے باپ کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ اُس نے بھائیوں سے اور باپ سے کہہ دیا کہ وہ عمر باپ کی خدمت میں گزار دے گی، شادی نہیں کرے گی۔ باپ نے اُسے بہت مجبور کیا۔ اس کے جواب میں وہ رو کر چُپ ہو جاتی تھی۔ اُس نے یہاں تک کیا کہ باپ نے کسی لڑکے کو پسند کر کے رشتہ منظور کر لیا تو لڑکی نے کسی عورت کی زبانی لڑکے والوں کو پیغام بھجوا دیا کہ میرا رشتہ لو گے تو پچھتاؤ گے، میں شادی نہیں کروں گی۔

لڑکی نے اپنے رویّے سے اپنے آپ کو بدنام کر لیا۔ باپ کو اس کے ساتھ اتنا ہی پیار تھا جتنا اُس کے ساتھ بیٹی کو تھا، اس لئے وہ بیٹی پر اپنا حکم نہیں چلاتا تھا۔ اس کے بجائے وہ بیٹی کی منتیں کیا کرتا تھا کہ وہ شادی کر لے۔ وہ اپنی بیٹی کی نیّت کو سمجھتا تھا۔ باپ اپنی بیوی کے غم میں تیزی سے بوڑھا ہونے لگا اور بیٹی جوان ہوتی جا رہی تھی۔ باپ کو اس کا غم بھی تھا۔ اس کا ایک علاج موجود تھا۔ یہ تھا بڑا بھائی۔

اس کی شادی ہو جانے سے گھر میں ایک لڑکی آجاتی جو اِن کے باپ کی خدمت کرتی مگر بھائی اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ رشتہ باپ کو اس لئے پسند نہیں تھا کہ لڑکی والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ تیس ہزار حق مہر لکھوائیں گے جو اُس زمانے میں بہت ہی زیادہ رقم تھی۔ اس کے علاوہ لڑکی والوں کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ لڑکے کا جائیداد میں سے جو حصّہ نکلتا ہے اس میں سے آدھا لڑکی کے نام کیا جاتے۔

باپ نے یہ رشتہ اِن مطالبات کی وجہ سے منظور نہ کیا لیکن بھائی کو یہی لڑکی پسند تھی۔ بشیر نے بتایا کہ لڑکی کی ماں بہت چالاک اور فریبی تھی۔ ان حالات میں بھائی کی شادی ملتوی ہوتی رہی۔ ان کی ماں مرچکی تھی، اس لئے رشتے کے سلسلے میں عورتوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے گھر میں کوئی عورت نہ رہی۔ ایسے مسئلے ہمارے ہاں عورتیں ہی طے کیا کرتی ہیں۔ رشیدہ اس معاملے میں ناتجربہ کار تھی۔

باپ نے بڑے بیٹے کی منّت کی کہ وہ اپنی بہن کی خاطر دوسری جگہ شادی کرلے مگر بھائی نہ مانا۔ رشیدہ باپ کی خاطر کوئی رشتہ قبول نہیں کر رہی تھی۔ آخر باپ نے بڑے بیٹے کے آگے ہتھیار ڈال دیتے لیکن لڑکی والوں کا ہر ایک مطالبہ نہ مانا۔ برادری کے بزرگوں کو درمیان میں ڈال کر معاملہ یُوں طے ہُوا کہ حق مہر تیس ہزار کی بجائے پنتیس ہزار لکھ دیں گے لیکن جائیداد باپ جب چاہے گا بیٹوں میں تقسیم کرے گا، پھر بیٹے کی مرضی ہے کہ آدھی جائیداد بیوی کے نام کر دے یا پُوری کر

دے ___ بڑے بھائی کی شادی ہوگئی۔

بھابی بھائی کو لے اُڑی

میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اس واردات میں جائیداد کا عمل دخل بھی ہے۔ دولت اور جائیداد میں ایسی لعنت ہے کہ خُون کے رشتوں کو دشمن بنا دیتی ہیں۔ بشیر سے معلوم ہُوا کہ بیس ایکڑ اراضی زیرِ کاشت ہے جو بٹائی پر دے رکھی ہے، شہر میں دو مکان کرائے پر چڑھے ہُوئے ہیں اور یہ ایک دو منزلہ مکان ہے جس میں یہ خاندان رہتا تھا۔ اس کے حصّہ دار دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اب باپ کی نئی دلہن بھی آگئی تھی۔ وہ ایک بیٹا جن کر دوسرے بیٹوں جتنے حصّے کی حقدار ہوسکتی تھی۔

بڑے بھائی نے شادی کی تو باپ نے بیٹی رشیدہ سے کہا کہ اُس کی خدمت کرنے کے لئے بہو آگئی ہے اس لئے وہ اب کوئی سا رشتہ قبول کرلے جن کے پیغام آرہے ہیں۔ رشیدہ نے کہا کہ وہ بڑے بھائی کی بیوی کو دیکھ لے کہ اس کے باپ کی خدمت کرتی بھی ہے یا نہیں۔ ایک مہینے میں ہی نظر آگیا کہ بہو کو اپنے صرف خاوند کے ساتھ دلچسپی ہے اور وہ گھر میں کسی اور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ رشیدہ کا بھائی اس لڑکی کو چاہتا تھا، اس لئے اس کا غلام ہو

گیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ لڑکی کی ماں بہت چالاک تھی۔ وہ بڑھاپے میں بھی خوبصورت تھی اور شگفتہ مزاج بھی۔ مردوں کو پھانسنا اور انگلیوں پر نچانا جانتی تھی۔ رشیدہ کا بڑا بھائی اس کا مرید ہو گیا۔ اس کی ساس اکثر ان کے گھر آتی اور بھائی اس کے گھر جاتا رہتا تھا۔

ماں بیٹی کا جادو چل گیا۔ بڑا بھائی پہلے تو یہ کہنے لگا کہ کرائے پر چڑھا ہوا ایک مکان خالی کرا کے اس میں رہے گا۔ باپ نے اسے سمجھایا کہ وہ کرایہ ضائع نہ کرے اور اپنے گھر میں رہے۔ رشیدہ نے بھی اسے کہا کہ باپ کو اس (رشیدہ) کی شادی کا غم کھا رہا ہے اس لئے وہ گھر میں رہے تاکہ اس کی بیوی باپ کی خدمت کرے اور رشیدہ کی شادی ہو جائے مگر بھائی کے دماغ پر بیوی اور ساس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اوپر کی منزل میں منتقل ہو گیا اور اس نے ہانڈی روٹی بھی الگ کر لی۔ کرتے کرتے باپ، بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا تعلق محلّے داروں کی طرح رسمی سا رہ گیا۔ کبھی سامنے آ گیا تو رسمی طور پر سلام دعا ہو گئی۔

رشیدہ کا مسئلہ جوں کا توں رہا بلکہ اب اس کا مسئلہ اس وجہ سے پیچیدہ ہو گیا کہ اس کی بھابی چالاک لڑکی تھی۔ اس کی طرف سے خطرہ تھا کہ اس کے باپ کی خدمت کرنے کی بجائے اسے پریشان کرے گی۔ لہٰذا اب رشیدہ اپنے باپ کی محافظ بھی بن گئی۔ بشیر نے بتایا کہ رشیدہ نے کبھی بھی ایسے افسوس کا اظہار نہیں کیا کہ اس کی شادی نہیں ہو

رہی۔ باپ کے ساتھ والہانہ پیار کرتی تھی۔ رات کو اپنے ہاتھوں اسے دودھ پلاتی تھی۔ دوپہر کو باپ کمرے میں سویا ہوا ہو تو رشیدہ برآمدے میں پہرہ دینے لگتی تھی کہ کوئی کمرے کے قریب نہ آئے اور اونچی بات نہ کرے۔ باپ گھر سے نکلتا تو رشیدہ دروازے تک اس کے ساتھ جاتی اور دروازے میں کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہتی تھی۔ باپ گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو رشیدہ دروازے سے ہٹتی تھی۔

مجھے بڑے بھائی کی بیوی کا خیال آیا۔ اسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ بشیر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے گھر گئی ہوئی ہے اور اس کی زچگی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں یہ بھی سوچنے لگا کہ جب رشیدہ کو پتہ چلے گا کہ اس کے باپ کو زہر دے کر مار دیا گیا ہے تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ بے ہوش تو وہ ضرور ہو گی۔

خودکشی؟ — بیٹی کی خاطر؟

رشیدہ کے متعلق سب کو یقین ہو گیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ صرف گھر والوں کو نہیں ساری برادری کو یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا رشتہ لینا ناممکن ہے۔ باپ نے ایک روز اپنے دونوں بیٹوں کو بٹھا کر کہا کہ جوان لڑکی کا گھر بیٹھے رہنا بے عزتی کا باعث ہے، خواہ بیٹی اپنی مرضی اور اپنی ضد سے ہی بیٹھی رہے۔ اس کا حل ہر قیمت پر نکالنا

تھا۔ بڑے بھائی نے کہا کہ اس کی شادی زبردستی کر دی جاتے، پھر یہ خاوند میں گھل مل جائے گی۔ باپ نے یہ تجویز نہ مانی۔ اس نے کہا کہ زبردستی کرنی ہوتی تو وہ بہت عرصہ پہلے کر چکا ہوتا۔ جس پاگل پن سے بیٹی نے اس کے ساتھ پیار اور ایثار کیا تھا اس کے جواب میں وہ زبردستی کر کے گناہگار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

باپ اور بشیر نے بڑے بھائی سے کہا کہ اُس کی بیوی اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی تو رشیدہ کی زندگی سنور جاتی۔ بھائی نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اپنی بیوی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔ باپ نے کہا — "تمہاری ماں کے مرنے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ دوسری شادی کر لوں۔ اب تو شادی کی عمر بھی گزر گئی ہے لیکن گھر میں جب تک کوئی عورت نہیں آئے گی، رشیدہ کی شادی نہیں ہو گی۔ مجھے یہی ایک راستہ نظر آتا ہے کہ میں کسی ایسی غریب سی بیوہ کے ساتھ شادی کر لوں جو پوری دلچسپی سے گھر سنبھال لے اور میرا خیال رکھے تاکہ رشیدہ بے فکر ہو جائے۔"

بیٹوں نے باپ کی اس تجویز کو پسند نہ کیا۔ باپ نے کہا — "پھر ایک اور طریقہ ہے۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ بیٹی میرے لئے اپنی جوانی قربان کر رہی ہے۔ میں اس کے لئے اپنی جان قربان کر دوں گا۔ مجھے اب زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔"

خودکشی کی سُن کر میں چونکا۔ یہ واردات خودکشی کی بھی ہو سکتی تھی۔

اس سے پہلے یہ شک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں نے بشیر سے بہت کچھ پوچھا لیکن اُس سے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے باپ کو کس وقت اور کس نے دُودھ دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ نے دُودھ پینے سے پہلے اُس وقت کچھ کھا لیا ہو جب اُس کی بیوی کمرے سے نکل کر برآمدے میں گئی اور اُس نے رشیدہ کے ہاتھ سے گلاس لیا تھا۔ بہرحال میں نے خودکشی کے امکان کو بھی ذہن میں رکھ لیا، مگر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اُسے خودکشی کرنی ہوتی تو شادی نہ کرتا۔ بشیر کے بیان کے مطابق اُس کے سامنے دو راستے تھے، شادی یا خودکشی۔ معاً میرے اس خیال کو ایک اور خیال نے رَد کر دیا۔ وہ یہ کہ بڑھاپے میں اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اُس کے لئے خودکشی ضروری ہو گئی ہو گی۔ اُسے اپنی غلطی اور اپنے بڑھاپے کا احساس شادی کر کے ہُوا ہو گا۔ یہ بھی ہُوا ہو گا کہ اُس کی بیوی نے اُس کی یہ توقع پُوری نہیں کی ہو گی کہ وہ اس کا اتنا ہی خیال رکھے جتنا رشیدہ رکھتی تھی۔

"اُس نے کہا تھا کہ کسی غریب بیوہ کے ساتھ شادی کرے گا۔" میں نے بشیر سے پوچھا — "پھر اُس نے جوان اور کنواری لڑکی کے ساتھ شادی کیوں کر لی؟"

"کیونکہ ہمارے ابّا کی جائیداد تھی اور جائیداد کی خاطر لڑکی دینے والے موجود تھے" — اُس نے جواب دیا — "ہم نہیں چاہتے

تھے کہ ابا دوسری شادی کریں لیکن رشیدہ کی خاطر انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ انہوں نے مناسب رشتے کی تلاش شروع کی تو اس لڑکی کے والدین نے لڑکی پیش کر دی۔ ابا کسی بیوہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اس وقت پتہ چلا جب سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے ابا کو منع کیا تھا۔ رشیدہ نے بھی انہیں روکا تھا مگر ابا کا دماغ ایسا چلا کہ انہوں نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔"

رشیدہ نے شادی پھر بھی نہ کی کیونکہ سوتیلی ماں پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔ رشیدہ شاید اپنے باپ کو کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ باپ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو رشیدہ کے بڑے بھائی کے ساتھ ہوا تھا۔ بیوی نے رشیدہ کے باپ پر قبضہ کر لیا۔ اس کی ماں بھی آ جاتی تھی مگر یہ لڑکی بوڑھے کے آرام اور خوراک وغیرہ کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ جب جی میں آتی اپنے گھر چلی جاتی۔ یہاں ہوتی تو یہ کوشش کرتی کہ رشیدہ باپ کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے۔ ایک مہینے بعد باپ کی صحت گرنے لگی اور وہ پریشان سا بھی نظر آنے لگا۔ بڑا بھائی لاتعلق رہتا تھا۔ اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا کہ گھر والے کس حال میں ہیں۔ اوپر والی منزل میں بشیر کی بھابی اس کوشش میں تھی کہ اس کا خاوند جائیداد تقسیم کراتے اور نیچے سوتیلی ماں اور اس کی ماں بوڑھے کی رگوں کو اپنے ہاتھ میں لے جا کر جائیداد پر قابض ہونے کے جتن کر رہی تھیں۔

"تمہارے بھائی کے ساتھ اور تمہارے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیسا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اوپر جاتی تھی" — بشیر نے جواب دیا — "مجھے معلوم نہیں کہ میرے بھائی کے ساتھ وہ کیا برتاؤ کرتی تھی۔ ایک روز بھابی کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی بول چال بند ہو گئی۔ میرے ساتھ شروع دنوں میں وہ کھچی کھچی رہی۔ دو تین مہینوں سے اس کا رویّہ بدل گیا ہے اور میرے ساتھ وہ دوستانہ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔"

"تم نے بے تکلفی قبول کر لی ہو گی۔"

وہ قدرے گھبرایا۔ فوراً سنبھل گیا۔ کہنے لگا — "اتنی زیادہ نہیں۔ سمجھ لیں کہ وہ مجھے اچھا سمجھنے لگی اور میرے دل میں اس کے خلاف جو کدورت تھی وہ نکل گئی۔"

لڑکی بے ہوش ہو گئی

رات تو بہت جا چکی تھی۔ نیند دماغ کو بیکار کر رہی تھی لیکن بڑے بھائی سے پوچھ گچھ ضروری تھی۔ صحیح معنوں میں تفتیش تو ابھی شروع کرنی تھی۔ جوں جوں میرا دماغ جواب دیتا جا رہا تھا یہ خواہش ابھرتی آ رہی تھی کہ پوسٹ مارٹم اور دودھ کی رپورٹ صاف نکلے اور میں یہ خوشخبری

سُنوں کہ مرنے والا زہر سے نہیں مرا، یہ ہیضے کا بڑا سخت حملہ تھا۔ خُدا پولیس والوں کی اس قسم کی دعائیں ذرا کم ہی سُنا کرتا ہے۔ میں نے دُودھ کا گلاس اور دیگچی بمع دُودھ ڈاکٹر کو بھیج دی تھی۔ یہ اشیاء اُسے کیمیاوی تجزیئے کے لئے دِلی بھیجنی تھیں۔

چھوٹے بھائی کو باہر بھیج کر میں نے بڑے بھائی کو اپنے پاس بُلایا۔ اُس کے ساتھ ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ باہر شور سا سُنائی دیا۔ کانسٹیبل جو میرے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اس سے پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی (رشیدہ) بے ہوش ہوگئی ہے۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ پتہ چلا کہ بشیر نے باہر جاتے ہی اپنی سوتیلی ماں اور رشیدہ کو بتا دیا کہ اس کا باپ مر گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ ڈاکٹر نے زہر کا شک کیا ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ میں نے بشیر سے کہا کہ میرے منع کرنے کے باوجود اُس نے انہیں بتا دیا ہے۔ اُس نے بھڑک کر کہا ــــ "آپ اپنا کام کریں۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ اتنی بڑی بات ان سے کب تک چھپاتے رکھتے؟"

میں نے دونوں لڑکیوں کا ردِّ عمل دیکھا۔ بیٹی کے متعلق پتہ چلا کہ بشیر نے اُسے یہ خبر سُنائی تو اُس کی آنکھیں اور مُنہ کھُل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھی اور غش کھا کر گر پڑی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اُس کی سوتیلی ماں خاموش تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تک نہیں تھی۔ رشیدہ کو ہوش میں لانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ میں

اُس کے بڑے بھائی کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ میں نے اُسے کہا۔ "یہ بڑھاپے میں جوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا نتیجہ ہے" ــــ پھر میں نے اس بھائی کو بُرا بھلا کہا کہ وہ اپنی بیوی کو قابو میں رکھتا تو وہ اُس کے باپ کو سنبھال لیتی اور اُس کی بہن کی شادی ہو جاتی۔

اُس نے مجھے جو باتیں بتائیں وہ اُس کے چھوٹے بھائی کے بیان کی تصدیق کرتی تھیں۔ اپنے بھائی کے متعلق اُس نے بتایا کہ یہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے۔ یاری دوستی میں باپ کا پیسہ تباہ کرتا پھرتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اُس نے بشیر کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ سوتیلی ماں کے ساتھ اُس کی بے تکلفی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

"کیا ان کی بے تکلفی کا باپ کو بھی علم تھا؟"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں ان کاموں میں دخل نہیں دیا کرتا تھا۔"

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے باپ نے خودکشی کی ہو؟"

"عین ممکن ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "شادی کرنے کے بعد صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ پچھتا رہا ہے۔"

"اور یہ کہاں تک ممکن ہے کہ تمہاری سوتیلی ماں نے اسے زہر دیا ہو؟"

"اس لڑکی کے والدین کی نظر ہماری جائیداد پر ہے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ہو سکتا ہے میرے ابّا نے اس لڑکی کو جواب دے

دیا ہو کہ وہ جائیداد کا کوئی حصہ اس کے نام نہیں کرے گا .... لیکن جناب! یہ لڑکی اتنی دلیر نہیں۔"

"تم نے باپ سے کبھی اپنا حصہ مانگا تھا؟"

"پہلے تو کبھی نہیں مانگا تھا" — اُس نے جواب دیا — "ابّا نے شادی کی تو میں نے حصہ مانگنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں تم سے ایک نازک سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "بُرا نہ ماننا۔ اگر تمہارے ابّا کو واقعی ہی زہر دیا گیا ہے تو مجھے قاتل کو پکڑنا ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ مجھے بعض ایسی باتیں پوچھنی اور کہنی پڑتی ہیں جو مجھے بھی اچھی نہیں لگتیں .... اپنی بہن کے متعلق تم کچھ جانتے ہو کہ کسی کو پسند کرتی ہے؟ ضروری نہیں کہ اس کے تعلقات ایسے ویسے ہوں۔"

"میری بہن گھومنے پھرنے والی لڑکی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "گھر میں پوری دلچسپی لیتی ہے۔ باپ پر تو جان بھی نثار کرتی تھی۔ دلیر ہے اور اپنی کرنے والی ہے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان ہے جس کا کچھ نہ کچھ تعلق میری بہن کے ساتھ ضرور ہے۔ میری بیوی نے تین چار بار دیکھا کہ میری بہن چھت پر گئی تو اُدھر لڑکا اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ میری بیوی نے ان کے اشارے بھی دیکھے تھے۔"

"یہ آدمی کیسا ہے؟"

"بد اخلاق نہیں" — اُس نے جواب دیا — "تیز طرّار لڑکا ہے۔"

میں نے یہ بات کچھ سوچے بغیر کہہ ڈالی تھی۔ یہ مجھے یقین تھا کہ بیٹی کا باپ کے قتل میں ہاتھ نہیں۔ یہ اُس صورت میں ہو سکتا تھا کہ باپ اُس کی شادی میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ بعض باتیں بلا سوچے اور غور کیے ذہن میں آجاتی ہیں اور ایسی باتوں میں بعض کام کی ہوتی ہیں۔ رشیدہ کے بھائی نے بتایا کہ پڑوس کا ایک نوجوان رشیدہ میں دلچسپی لیتا ہے تو میرے دماغ میں کئی خیال آئے اور میں ان پر غور کرنے لگا۔

ان دونوں بھائیوں کو اپنے باپ کی لاش وصول کرنی اور کفن دفن کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ گھر میں اور کوئی مرد نہیں تھا۔ میں نے بڑے بھائی سے کہا کہ وہ فوراً جائیداد کے کاغذات دیکھے اور انہیں اپنے قبضے میں لے لے۔ مجھے یہ شک تھا کہ اس کی سوتیلی ماں نے جائیداد کا کچھ حصہ اپنے نام کروا لیا ہوگا اور اب اس سے آزاد ہونے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسے زہر پلا دیا۔

بم جو مجھ پر گرا

دوسرے دن ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دی جو پوری طرح واضح نہیں تھی۔ وہاں کے سرکاری ہسپتال میں اتنے باریک معائنے کا انتظام نہیں تھا تاہم ڈاکٹر نے موت کا باعث زہر لکھا تھا۔ اُس نے

منہ سے نکلنے والی جھاگ اور قے کی کچھ مقدار، دُودھ کا گلاس اور دیگچی میں سے دُودھ کی تھوڑی سی مقدار کیمیاوی تجزیئے کے لئے بھیج دی تھی۔ ان اشیاء کے ساتھ مقتول کے معدے اور جگر کا بھی کچھ حصّہ کاٹ کر بھیج دیا تھا۔ رپورٹ زیادہ سے جلدی تیسرے روز آسکتی تھی۔

میں ڈاکٹر کی رپورٹ پڑھ کر شک میں پڑ گیا۔ میں ڈاکٹر سے ملا تو وہ بھی گول گول سی بات کر رہا تھا۔ مجھے مقتول کی بیٹی کا بیان لینا تھا۔ اُس سے بہت کچھ پوچھنا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اتنی جلدی بیان دینے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ مقتول کی بیوی کا بیان ضروری تھا۔ میں نے مُخبروں کو سرگرم کر دیا۔

مُخبروں نے تقریباً وہی باتیں بتائیں جو بشیر اور اُس کا بڑا بھائی بتا چکے تھے۔ بشیر کے متعلق اُنہوں نے بتایا کہ محلّے میں اُس کے اور اُس کی سوتیلی ماں کے متعلق لوگ مشکوک سی باتیں کرتے ہیں۔ رشیدہ کے متعلق میری ایک مُخبر عورت نے بتایا کہ محلّے کے ایک آدمی کے ساتھ جو اس کا ہم عمر ہے، اس کا میل جول ہے جو ہے تو درپردہ لیکن کئی عورتوں کو معلوم ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس آدمی کے لئے بھی رشیدہ کا رشتہ مانگا گیا تھا لیکن جواب دے دیا گیا تھا۔ مُخبر یہاں تک معلومات لے آئے کہ اُس کے رشتے کے لئے جو بھی پیغام آتا تھا اُسے رشیدہ خود ٹھکرا دیتی تھی۔ اس سے وہ بدنام ہو گئی تھی۔

یہ آدمی جس کے متعلق کہا جا رہا تھا کہ اس کا رشیدہ کے ساتھ

میل جول ہے، اپنے دوستوں کو بتا چکا تھا کہ وہ رشیدہ کے ساتھ ہی شادی کرے گا اور یہ کہ رشیدہ اُسے پسند کرتی ہے۔ یہ آدمی ایسا پروپیگنڈہ اس لئے کرتا تھا کہ کسی کو لڑکی کے رشتے کا جواب مل جاتے تو وہ اسے اپنی بے عزّتی سمجھتا ہے۔ بہرحال یہ خبر میرے لئے اہم نہیں تھی کہ اس لڑکی کے کسی کے ساتھ مراسم ہیں یا نہیں۔ البتہ لڑکی کے چھوٹے بھائی بشیر کے تعلّقات اگر اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ ہیں تو اس سے مجھے تفتیش میں کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

لیکن مجھ پر ایک بم آپڑا۔ کیمیاوی تجزیئے کی جو رپورٹ آئی تو اس میں لکھا تھا کہ مقتول زہر سے مرا ہے لیکن دُودھ کا جو نمونہ بھیجا گیا تھا اس میں زہر کی آمیزش نہیں تھی۔ حد یہ کہ دُودھ کا گلاس جس میں دُودھ کے چند ایک قطرے تھے اور جس کے اندر دُودھ اور کچھ بالائی لگی ہوتی تھی، وہ بھی صاف نکلا۔ اس میں بھی زہر کی آمیزش نہیں تھی۔ مقتول کے معدے اور جگر کے ٹکڑے، قے اور جھاگ کے نمونے بھی بھیجے گئے تھے۔ ان کے لیبارٹری معائنے سے رپورٹ میں لکھا تھا کہ موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ میں یہ رائے دی گئی تھی کہ زہر اگر دُودھ میں نہیں دیا گیا تو دو چار روز پہلے دیا گیا ہے جو آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا ہے۔

ڈاکٹر نے جب مجھے یہ رپورٹ پڑھ کر سنائی تو میں کچھ دیر احمقوں کی طرح اُس کے مُنہ کو دیکھتا رہا۔ اُس نے ہنس کر کہا ”اگر آپ یہ رپورٹ لکھ دیں کہ یہ خودکشی کی واردات ہے تو آپ سے کون باز پُرس

کر سکتا ہے؟"

"یہ مرنے والے کی بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوگی" ۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں پوری تفتیش کر کے رپورٹ لکھوں گا" ۔ میں نے ڈاکٹر کو تفصیل سے بتایا کہ رشیدہ اپنے باپ کے لئے کیا قربانی دے رہی تھی اور اس معاملے میں وہ دیوانگی کی حد تک جذباتی تھی۔

میرا ذہن دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ موت خودکشی ہی ہو سکتی تھی لیکن میں نے مرنے والے کے دونوں بیٹوں اور اس کی بیوی سے جو پوچھ گچھ کی تھی اس سے مجھے کچھ اشارے ملے تھے جن سے شک ہوتا تھا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ مخبروں کی رپورٹیں اس شک کو پختہ کرتی تھیں۔ میں نے آپ کو ان تمام افراد کے بیان، ان پر جرح اور ان کے جواب اور مخبروں کی رپورٹیں اتنی مختصر سناتی ہیں کہ آپ ان میں سے وہ اشارے نہیں پا سکے ہوں گے جو مجھے نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر پولیس افسر کی ایک چھٹی حس ہوتی ہے اور چونکہ پولیس والوں کا واسطہ ہر قسم کے انسانوں سے پڑتا ہے اس لئے انسان کے سینے کے راز پڑھنے کا تجربہ ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے لئے یہ مشکل پیدا کر لی کہ اس واردات کو خودکشی کہنے کی بجائے اسے ۳۰۲ (قتل) کی واردات رہنے دیا اور تفتیش جاری رکھی۔

مقتول کی وصیت

رشیدہ کے بڑے بھائی سے میں نے کہا تھا کہ وہ جائداد کے کاغذات دیکھے اور مجھے بھی دکھائے۔ اس نے مجھے کاغذات دکھا دیئے۔ یہ ایک لفافے میں بند تھے۔ ان میں سے ایک اور کام کا کاغذ نکلا۔ یہ مرنے والے کا وصیت نامہ تھا جو اشٹامپ پر لکھا ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد جائداد کس طرح تقسیم کی جاتے۔ مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں رہی۔ اس میں دونوں بھائیوں اور رشیدہ کا حصہ برابر تھا اور ان کی سوتیلی ماں کا حصہ بہت ہی تھوڑا لکھا گیا تھا۔ میں نے وصیت نامے پر تاریخ دیکھی۔ یہ اس نے موت سے تین ساڑھے تین مہینے پہلے لکھا تھا۔ اگر یہ موت سے دو چار روز پہلے لکھا ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ مرنے والے نے یہ وصیت خودکشی سے پہلے لکھی تھی۔

"کیا تم نے یہ وصیت نامہ اس سے پہلے بھی دیکھا تھا؟" ۔ میں نے اس کے بڑے بیٹے سے پوچھا۔

"نہیں" ۔ اس نے جواب دیا ۔ "میں نے اپنی سوتیلی ماں کو بتائے بغیر ٹرنکوں کی تلاشی لی تو یہ بند لفافہ برآمد ہوا"

بہت دن گزر چکے تھے۔ میں مقتول کی دوسری بیوی اور بیٹی کا

بیان لینے کے لئے اُن کے گھر چلا گیا۔ بیوی کو کمرے میں بٹھایا۔ اُس کے چہرے پر اتنی ہی اُداسی تھی جتنی کسی بیوہ کے چہرے پر ہو سکتی ہے۔ اس تاثر میں پولیس کا ڈر اور گھبراہٹ بھی شامل تھی۔

"تمہارے خاوند نے جب وصیت نامہ لکھ کر تمہیں دکھایا تھا تو تم نے اُسے یہ کیوں نہیں کہا تھا کہ اپنی زندگی میں جائداد تقسیم کر دو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے کوئی وصیت نامہ نہیں دکھایا تھا۔" — اُس نے حیران سا ہو کے جواب دیا۔

"اُس نے تمہیں یہ تو بتایا تھا کہ تمہیں وہ کتنا حصہ دے رہا ہے۔"

"انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔" — اُس نے جواب دیا۔

"تم جب اُسے کہا کرتی تھیں کہ جائداد سے تمہیں حصہ دے دے تو وہ کیا جواب دیا کرتا تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا — "تم جھوٹ ہی نہ بولتی جاؤ۔ مجھے ایسی بہت سی باتوں کا علم ہے جو تم سمجھتی ہو گی کہ میں نہیں جانتا .... کیا تمہاری ماں جائداد میں سے تمہارے حصے کے لئے اُس کے پیچھے نہیں پڑی رہتی تھی؟ تم دونوں نے اُسے اپنا قیدی نہیں بنا لیا تھا؟"

اُس کے آنسو بہنے لگے اور وہ بولی — "ایک تو میری ماں کو جائداد کا لالچ تھا جس سے میں اُسے روکتی تھی، دوسرے آپ یہ شک

کر رہے ہیں کہ میں نے خاوند کو زہر دیا ہے۔"

"میرا شک دُور کر دو" — میں نے کہا — "مجھے تمہارے خلاف کوئی دشمنی نہیں۔ میرا شک یہ ہے کہ تم نے اُسے زہر دیا ہے لیکن میرا شک یہ بھی ہے کہ تم نے اُسے زہر نہیں دیا۔ مجھے جتنی دلچسپی تمہیں بے گناہ ثابت کرنے میں ہے اتنی دلچسپی تمہیں مجرم ثابت کرنے میں نہیں۔ میری مدد کرو .... کیا جائداد کا لالچ صرف تمہاری ماں کو تھا؟"

"صرف میری ماں کو" — اُس نے جواب دیا — "جائداد کی خاطر ہی اُس نے میرا رشتہ انہیں دیا تھا۔ اب میں آپ کو سچی بات بتاتی ہوں کہ انہوں (مقتول) نے مجھے تین چار بار کہا تھا کہ تمہاری ماں کو ذرا سی بھی دلچسپی نہیں کہ میری تمہاری آپس میں بنتی ہے یا نہیں۔ یہ تو چاہتی ہے کہ آدھی جائداد تمہارے نام کر دوں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ اگر میرے بچے پیدا ہوتے تو انہیں آپ جائداد کا حصہ دیں گے۔ میری جائداد پہلے خاوند سے پھر بچے۔ مجھے جائداد کیا کرنی ہے؟"

"تمہارے دل میں خاوند کی محبت تھی؟"

"پہلے نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "کوئی جوان لڑکی اپنی عمر سے دُگنی عمر کے آدمی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن شادی کے بعد محبت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اتنی محبت دی جتنی اپنے باپ سے بھی نہیں ملی تھی۔" — اُس نے ذرا جھینپ کر کہا — "اُن کی عمر

بے شک زیادہ تھی لیکن وہ بوڑھے نہیں تھے۔"

"میں تو سمجھتا تھا کہ تمہارے دل میں خاوند کے خلاف نفرت ہو گی۔"

"اگر نفرت تھی تو اپنے باپ کے خلاف تھی" — اُس نے میری حوصلہ افزائی اور ہمدردانہ باتوں سے کھُل کر بولنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے لگی — "اُسے اگر میرے ساتھ پیار ہوتا تو میرا رشتہ یہاں نہ دیتا۔ وہ میری ماں کی باتوں میں آگیا اور اپنے دل میں جائداد کی محبت پیدا کر لی اور اس کے عوض میرا رشتہ جوان اولاد کے باپ کو دے دیا۔ میں بہت روئی تھی لیکن خاوند نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔"

یہاں میں اپنے اور آج کے زمانے کا ایک فرق بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کل پچاس سال کا پاکستانی ستّر سال کا بوڑھا لگتا ہے اور ہمارے جوان تیس سال میں ہمارے دَور کے پچاس سالہ آدمی جیسے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں سکون اور اطمینان تھا، مہنگائی اور ملاوٹ نہیں تھی، کردار کو بگاڑنے والے آج والے ذرائع نہیں ہُوا کرتے تھے، اس لئے صحت کا معیار آج کی نسبت بہت اچھا تھا۔ ستّر سال تک لوگ تندرست اور توانا رہتے تھے پچاس سال کو بڑھاپے کی عمر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لڑکی کا یہ کہنا کہ اُس کے دل میں خاوند کی محبت پیدا ہو گئی، میرے لئے کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سات ماہ بعد وہ ایک بچّے کی ماں بن جاتے گی۔

اُس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں خاوند کے خلاف نفرت کی بجائے محبت تھی یا کم از کم اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ باتوں میں یا جذبات میں آکر یقین کر لینے سے مجرموں کو نہیں پکڑا جا سکتا۔ میں نے اُسے جرح اور سوال در سوال کے جال میں پھانسنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے صاف نظر آتی تھی۔ خودکشی کے امکان کو ذہن میں رکھ کر بھی میں نے اُس سے بہت کچھ پُوچھا۔ اُس نے بتایا کہ خودکشی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے اُس سے یہ بھی پُوچھا کہ جب اُس نے خاوند کو دُودھ دیا تھا تو کیا وہ کمرے سے نکل گئی تھی؟ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس نے کوئی زہر کھا لیا ہو گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اُس کے پاس رہی اور تھوڑی دیر بعد وہ لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد اُسے تکلیف شروع ہُوئی تھی۔

مرنے سے پہلے تین چار دن اُس کے خاوند کو معدے میں جلن اور سر کی گرانی کی شکایت رہی تھی۔ اس لڑکی نے اس کا ذکر پہلے بھی میرے ساتھ کیا تھا۔ اب میں نے اس کی تفصیلات پوچھیں تو معلوم ہُوا کہ وہ خاصی تکلیف میں تھا اور دیسی دوائیاں جو گھر میں رکھی تھیں

اور چورن وغیرہ کھاتا رہا تھا۔ موت کی رات شام کے بعد اُس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اُس نے کہا کہ صبح وہ ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔ بہرحال یہ اس لڑکی کا بیان تھا جو صحیح بھی ہو سکتا تھا، غلط بھی۔ میں جو چیز نوٹ کر رہا تھا وہ لڑکی کا انداز اور لب و لہجہ تھا۔ اُس کا ذہن مجرمانہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ گھر میں اُس کی اس تکلیف کے متعلق کسے معلوم ہے۔ اُس نے بتایا کہ رشیدہ کو معلوم ہے۔ بڑے بیٹے کو باپ کی اس لئے پرواہ نہیں تھی کہ اپنی بیوی میں مگن رہتا تھا اور چھوٹا زیادہ تر گھر سے غائب رہتا تھا۔

"اس کی کیا وجہ ہے کہ تم بشیر کو زیادہ پسند کرتی تھیں؟"

"آوارہ لڑکا ہے" — اُس نے جواب دیا — "میرے ساتھ کھچا کھچا رہتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک شروع کر دیا۔ وہ تو میرے ساتھ بات بھی نہیں کیا کرتا تھا۔"

میں نے اس سے بشیر کے ساتھ تعلقات کے متعلق دانستہ اور کچھ نہ پوچھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ صحیح بتا دیتی۔ یہ میں دوسرے ذرائع سے معلوم کر رہا تھا۔ اس سے میں نے رشیدہ کے متعلق پوچھا۔ اپنے باپ کے ساتھ اسے جو پیار تھا وہ اس نے ویسے ہی بتایا جیسے دوسرے بتا چکے تھے۔ اس نے یہ بتایا کہ باپ رشیدہ کے متعلق بہت پریشان رہتا تھا۔ اس نے دو تین بار کہا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے وہ جلدی مر جانا چاہتا ہے۔

"رشیدہ کے متعلق یہ کہاں تک سچ ہے کہ محلّے کے کسی آدمی کے ساتھ اُس کا میل جول تھا؟"

"بے شک رشیدہ مجھ سے ناراض رہتی ہے لیکن میں اس کے خلاف کوئی غلط بات نہیں کروں گی" — اُس نے کہا — "میں جب بیاہی ہوئی اس گھر میں آئی تو کوئی ایک مہینہ ہم دونوں گہری سہیلیاں بنی رہیں۔ ہم تقریباً ایک ہی عمر کی ہیں۔ اس کی بھابی بھی ہمارے ساتھ بے تکلف رہی۔ ہمارے تعلّقات بعد میں بگڑے تھے۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسری سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھیں۔ رشیدہ نے اپنے باپ کی خاطر بہت رشتے ٹھکرائے ہیں جن کا اسے کوئی افسوس نہیں۔ اس آدمی کا بھی پیغام آیا تھا۔ رشیدہ نے یہ بھی قبول نہ کیا لیکن یہ واحد رشتہ ہے جسے ٹھکرا کر رشیدہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسی لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اپنے ابّا کو نہیں چھوڑے گی۔ اس نے مجھے اور بھابی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے اس لڑکے سے کہا تھا کہ وہ اس شرط پر اس کے ساتھ شادی کرے گی کہ وہ اس کے گھر آ کر رہے ....

"اپنے ماں باپ اور گھر بار ہوتے ہوئے کون گھر جوائی بنتا ہے۔ لڑکے نے تو رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن اُس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اُس کے ماں باپ نہیں مانیں گے۔ رشیدہ نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس لڑکے نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کی خاطر اپنی شادی کہیں اور

ملنے نہیں ہونے دے گا۔ وہ رشیدہ سے کہتا رہتا تھا کہ وہ باپ کی زندگی میں شادی کرلے لیکن رشیدہ نہیں مانتی تھی اور اس لڑکے کو چھوڑتی بھی نہیں تھی۔ ان کی ملاقاتیں اس لڑکے کے گھر میں ہوتی تھیں اور ایک اور گھر میں بھی۔ بڑے بھائی کی شادی سے پہلے ان دونوں نے یہاں تک دلیری کی کہ کبھی کبھی رات کو لڑکا کوٹھوں کے اوپر اوپر سے ہمارے کوٹھے پر آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ اُس وقت رکا جب اس کا بڑا بھائی شادی کرکے اپنی بیوی کے ساتھ اوپر رہنے لگا۔ میں رشیدہ کو جانتی ہوں۔ اس کی محبت بالکل صاف اور پاک ہے۔ اگر وہ ایسی ویسی ہوتی تو باپ کی پرواہ نہ کرتی اور شادی کرلیتی۔ باپ کے متعلق وہ اتنی جذباتی تھی کہ میرے ساتھ بلاوجہ ناراض ہوگئی جیسے میں نے اس سے اس کا باپ چھین لیا ہو۔"

"اس آدمی کے والدین نے اس کی شادی کی کہیں اور کوشش کی ہوگی؟"

"اُس کے والدین اُس کے متعلق اتنا ہی پریشان رہتے ہیں جتنا رشیدہ کا باپ رشیدہ کے لئے پریشان رہتا تھا۔ اُس کی ماں نے رشیدہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ ہاں کہہ دے اور ان کے بیٹے کی زندگی تباہ نہ کرے۔ اُس نے مجھے بھی کہا تھا اور رشیدہ کی بھابی کو بھی لیکن رشیدہ نہیں مانی تھی۔ لڑکے کو گھر والوں نے کہیں اور شادی کے لئے مجبور کیا تھا جس پر ایک دوبار ان کے گھر دنگا فساد بھی ہوا تھا۔"

اس لڑکی نے مجھے بہت کچھ بتایا۔ رشیدہ کی محبت کی کہانی بھی سنادی لیکن میری تفتیش ایک اینچ اور ایک لفظ آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ تو میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ رشیدہ نے اس آدمی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اپنے باپ کو زہر دے دیا ہو۔ البتہ یہ شک ہلکے سے اشارے کی طرح میرے ذہن میں آیا کہ اس آدمی نے رشیدہ کے باپ کو راستے سے ہٹانے کے لئے اسے زہر دے دیا ہوگا۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اس آدمی کے ساتھ بھی ملاقات کروں گا۔ زہر دینا یا کسی اور طریقے سے کسی کو قتل کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لئے پتھر دل اور مُردہ ضمیر کی ضرورت ہوتی ہے، یا جذبات کی ایسی شدت کہ انسان کا دماغ پاگل پن کی حد تک پہنچ جاتے۔

مقتول کی موت کا منتظر

میں نے مقتول کی بیوہ کو باہر بھیج کر رشیدہ کو بلایا۔ اُس کی ذہنی حالت بہت بُری تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے ہمدردی کا اظہار کیا تو وہ ہچکیاں لینے لگی۔ بہت مشکل سے اسے سنبھالا مگر بولتی کم تھی۔ سر کے ہلکے سے اشارے سے ہاں یا نہ کا اظہار کرتی تھی۔

"رشیدہ!" ــ میں نے سیدھا سوال کیا ــ "کچھ بتا سکتی ہو تمہارے

"ابا کو کس نے زہر دیا ہے؟" — وہ چپ رہی۔ میں نے کہا — "جس کسی پر شک ہے مجھے بتا دو، میں اُسے تمہارے سامنے ہتھکڑی لگاؤں گا اور پھانسی دلاؤں گا۔"

"پتہ نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں کچھ نہیں بتا سکتی" — اور وہ پھر رونے لگی۔

ضرورت یہ تھی کہ اس کے جذبات کا ساتھ دیا جاتا، ورنہ اس کی زبان سے کچھ کہلوانا بڑا ہی مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر اس کی جذباتی کیفیت کے مطابق سوال کرتا رہا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کے خلاف، اُس کی ماں کے خلاف اور اپنی بھابی کے خلاف بہت باتیں کیں لیکن زہر دینے کا الزام کسی پر نہ لگایا۔ میں نے اس سے باپ کے وصیت نامے کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اپنے بھائیوں کے متعلق بھی اُس نے کوئی اچھی بات نہ کی۔ میں نے اس کے چھوٹے بھائی بشیر کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تو آوارہ ہے۔

"باپ کے ساتھ اس کا کبھی لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — اس نے جواب دیا — "میرے ابا لڑائی جھگڑا کرنے والے نہیں تھے۔ بڑے پیارے انسان تھے۔ بشیر کے متعلق انہیں افسوس بہت تھا کہ کام کا نہ نکلا۔"

میں نے اس کے ساتھ اتنی باتیں کیں اور پوچھیں کہ اس کے دل سے پولیس کا ڈر نکل گیا۔ میں گھما پھرا کر بات اُس لڑکے پر لے آیا جسے

وہ چاہتی تھی۔ وہ آخر پردہ نشین اور کنواری لڑکی تھی۔ جھینپ گئی۔ میں نے اس کی جھینپ دُور کر دی۔ اس نے اتنا ہی کہا — "ہاں.... وہ اچھا آدمی ہے۔"

"وہ بہت اچھا آدمی ہے" — میں نے کہا — "جس نے تمہاری خاطر شادی نہیں کی اور اپنے والدین سے جھگڑا بھی کیا اُسے میں بہت اچھا آدمی کہوں گا۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ اُس نے اپنے ماں باپ سے جھگڑا کیا تھا؟" — اس نے پُوچھا۔

"مجھے سب کچھ معلوم ہے" — میں نے کہا — "لیکن کسی کو اپنی زندگی کا ساتھی پسند کرنا کوئی جرم نہیں۔ ابا کی وفات کے بعد وہ تمہیں ملا تھا؟"

"اُس کا پیغام ملا تھا" — اس نے جواب دیا — "مجھے اُس کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے کہا ہے کہ اب شادی کی تیاری کرو۔ ابھی ابا کا چالیسواں بھی نہیں ہُوا اور وہ شادی کی تیاری کی باتیں کر رہا ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا ہے؟"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا" — اُس نے کہا — "ایسی بے موقع بکواس کا میں کیا جواب دیتی؟"

"وہ تمہارے ابا کی موت کا انتظار کرتا رہا ہے" — میں نے کہا — "میں تو اس سے یہ مطلب لوں گا کہ اُس کا دماغ بہت چھوٹا ہے، یا تمہیں

وہ اَنا زیادہ چاہتا ہے کہ اُسے یہ بھی پرواہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں" — اُس نے کچھ شرما کر کہا — "آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اُس نے میری خاطر کئی اور رشتہ قبول نہیں کیا اور گھر والوں کے ساتھ لڑائی بھی کی ہے۔ اسی لئے وہ میرے ساتھ کوئی اُلٹی سیدھی بات کر دے تو میں برداشت کر لیتی ہوں۔ وہ تو اس سے زیادہ بیہودہ باتیں کیا کرتا ہے۔"

لڑکی نے اُسے مایوس کیا

اُس کے انداز سے مجھے شک ہوتا تھا جیسے وہ اُس کی باتیں کر کے سکون یا لُطف محسوس کر رہی ہو۔ اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی محبت کتنی گہری ہے۔ اس لیے جب یہ بتایا کہ اس آدمی نے اسے کہا ہے کہ اب شادی کی تیاری کرو تو میں نے ذہن میں دھچکہ سا محسوس کیا۔ یہ پولیس کا ذہن تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس آدمی کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔

"وہ کس قسم کی بیہودہ باتیں کیا کرتا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

وہ جھینپ گئی، پھر کہنے لگی — "نہیں۔ میرا مطلب کسی اور بیہودہ بات سے نہیں تھا۔ مجھ پر یہ زور دیا کرتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ ابّا کی زندگی میں ہی شادی کر لوں۔ میں نہیں مانتی تھی۔ پہلے میں نے اُس کے

ساتھ وعدہ کیا کہ میرے بڑے بھائی کی شادی ہو جاتے تو میں ایک مہینے بعد اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی مگر میری وہ توقع پُوری نہ ہُوئی جس پر میں نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ بڑے بھائی کی شادی ہُوئی تو بیوی نے اسے ہم سے الگ کر لیا۔ ابّا نے دوسری شادی کی تو بھی میں نے اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا، مگر میری یہ امید بھی پوری نہ ہُوئی۔ ابّا کی جس طرح میں خدمت کرتی تھی اس طرح میری سوتیلی ماں نے نہ کی۔ میں نے اسے پھر مایوس کر دیا اور کہا کہ میں ابّا کو اپنی بھابی اور سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی" — اس نے کہا — "پھر مجھے تمہارے ابّا کی موت کا انتظار کرنا پڑے گا' — میں ہنسی بھی اور اُسے بُرا بھلا بھی کہا....

"اُس نے کہا — 'تمہارے ابّا کی صحت اتنی اچھی ہے کہ وہ جلدی مرتے نظر نہیں آتے' — میں اس سے روٹھ گئی اور اس نے مجھے منا لیا۔ پھر ابّا نے شادی کر لی تو وہ خوش ہُوا لیکن ڈیڑھ دو مہینوں بعد میں نے اسے پھر مایوس کیا تو اس نے غصّے سے کہا — 'اب یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ تمہارے باپ کے مرنے کی دعائیں کروں یا اپنے ہاتھوں اُسے زہر دے دوں' — میں اُس پر برس پڑی۔ وہ پہلے ہی غصّے میں تھا۔ اُس نے کہا — 'تم بلاوجہ باپ کے لئے پاگل ہُوئی جا رہی ہو۔ تم یہ بھی نہیں سوچتی کہ وہ تمہاری اس ضِد سے بہت پریشان رہتا ہے اور تمہیں اپنی عزت بے عزّتی کا بھی احساس نہیں۔ تم نے اپنی

زبان سے رشتے ٹھکراتے ہیں اس لئے لوگ تمہیں بدنام کر رہے ہیں‘— میں نے اُس کی باتوں پر دھیان نہ دیا اور اسے کہا کہ آئندہ اُسے نہیں ملوں گی۔ میں کوئی ایک مہینہ اسے نہ ملی۔ ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ کھڑا تھا۔ اس نے بلند آواز سے میرے چھوٹے بھائی کے متعلق پوچھا تاکہ کوئی سُنے تو یہی سمجھے کہ وہ میرے بھائی سے ملنے آیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے کہا کہ ناراضگی معاف کردو، آج آنا۔ وہ چلا گیا....

”میں اُس سے ملی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ میرے دل میں اُس کی محبت تھی۔ میں مان گئی۔ اس نے پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش شروع کردی کہ میں ابا کی موجودگی میں شادی کرلوں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مجھے بتایا کہ اپنے باپ کے ساتھ اُس کی بہت جھک جھک ہوئی ہے۔ ماں نے بھی اسے بُرا بھلا کہا ہے۔ باپ نے اسے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اسے جائداد سے محروم کردے گا اور گھر سے نکال دے گا۔ اس کی ماں نے میرے خلاف اس قسم کی باتیں کیں کہ یہ بدچلن لڑکی ہے۔ اس کے تعلقات جانے کس کس کے ساتھ ہیں۔ اسی لئے یہ شادی نہیں کرتی.... یہ ساری باتیں مجھے سُنا کر اُس نے کہا— ’یا مجھے خودکشی کرلینی چاہیئے یا تمہارے باپ کو‘— میں نے اس کے جواب میں ناراضگی کا اظہار نہ کیا کیونکہ وہ بہت ہی پریشان تھا۔ میں اس کی اتنی پریشانی برداشت نہیں کر

سکتی تھی۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ مجھے کتنا اچھا لگتا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ لڑکی واقعی بدچلن ہے جو اتنی دلیری اور بے حیائی سے باتیں کرتی ہے لیکن میں خدا کے سامنے شرمسار نہیں کیونکہ میرا دل اور میری نیت بالکل صاف ہے اور میں پانچ وقت کی نمازی ہوں .... میں نے تنگ آکر اسے کہہ دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کو ناراض نہ کرے اور ان کی مرضی کے مطابق شادی کرلے۔ وہ میرے منہ سے یہ بات نہیں سُننا چاہتا تھا۔ اس کا مزاج پہلے ہی گرم اور اُکھڑا ہوا تھا۔ میری یہ بات سُن کر وہ اور زیادہ گرم ہوگیا۔ اس نے مجھے بھی بڑی سخت باتیں کہہ دیں۔ اس نے یہ بھی کہا— ’باپ نے مجھے گھر سے چلے جانے کو کہا تو میں تمہیں گھر سے اُٹھا کرلے جاؤں گا‘— وہ غصّے میں کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ میں نے اسے کہا— ’مجھے چاہنے والے اور میرے ساتھ شادی کرنے والے کئی مل جائیں گے، باپ اور نہیں ملے گا‘— میرے آنسو بہنے لگے اور میں آگئی۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”ابا کی وفات سے کوئی ایک مہینہ پہلے کی“— اُس نے جواب دیا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے ابا کو اسی نے زہر دیا ہے تو تم کیا کہو گی؟“

”میں نہیں مانوں گی۔“

”کیوں؟.... اس میں اتنی جرأت نہیں؟“

"جرأت؟" اُس نے کہا۔ "وہ بہت دلیر اور نڈر ہے۔ وہ تو اپنے باپ کو قتل کرنے سے نہ ڈرے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اسے دل سے پسند کرتی ہوں۔ میرے ابّا کی طرح وہ پکا مرد ہے۔"

میں نے مزید کریدا اور ایسے اشارے ملے جو میرے ذہن میں شک پیدا کرتے گئے۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ میں تھانے چلا گیا۔

فرار اور تعاقب

دوسرے دن اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اس آدمی کی دکان کا پتہ بتا کر کہا کہ اسے تھانے بلا لائے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا کہ واپس آتے اتنی دیر لگتی۔ پیدل دس منٹ کا راستہ تھا مگر ہیڈ کانسٹیبل ڈیڑھ گھنٹے بعد آیا۔ اُس کے پیچھے جلوس چلا آ رہا تھا اور اُس نے ایک خوبصورت جوان کو بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ جوان ہانپ رہا تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔ جلوس تھانے کے احاطے کے باہر رک گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور اس جوان کے ساتھ تین آدمی آئے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ ان تین آدمیوں میں ایک اس جوان کا باپ، ایک چچا اور ایک کوئی اور تھا۔ یہ وہی جوان تھا جسے رشیدہ چاہتی تھی۔

"یہ تو فرار ہو گیا تھا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"اس بے گناہ کو آپ نے تھانے کیوں بلایا ہے؟" اُس کے باپ نے پوچھا۔ دوسرے دو آدمیوں نے بھی اسی طرح کی کوئی بات کی۔

"آپ لوگوں کو یہ کس نے کہا ہے کہ میں نے اسے مجرم سمجھ کر تھانے بلایا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس سے دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔ پھر یہ گھر چلا جائے گا۔" میں نے اس جوان سے پوچھا۔ "تم تو سُنا تھا بہت دلیر اور پکے مرد ہو، بھاگے کیوں تھے؟ میں تمہیں پھانسی نہیں دوں گا۔"

اس کے ساتھ آتے ہوئے آدمیوں سے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر چلے جائیں۔ یہ ملزم نہیں ہے۔ اسے پریشان نہیں کیا جائے گا۔ بڑی مشکل سے ان تینوں کو چلتا کیا اور اس جوان کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے الگ کر کے بتایا کہ یہ آدمی اپنی دکان میں مل گیا۔ ان کی کپڑے کی بڑی دکان تھی۔ اس کا باپ بھی دکان میں موجود تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس سے پوچھا کہ افضل تمہارا نام ہے؟ اس کا رنگ اُڑ گیا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے باپ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ اسے زہر خورانی کی واردات کی تفتیش کے لئے تھانے لے جانا ہے۔ افضل کانپنے لگا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے گلّا کھول کر اس میں سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور ہیڈ کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "جاؤ بھائی صاحب! کہہ دینا کہ یہ نہیں ملا۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ اسے تھانیدار صاحب بلا رہے ہیں۔ ایک دو باتیں پوچھ کر واپس بھیج دیں گے مگر لڑکا اُٹھتا نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ یہ شرافت سے نہیں جاتے گا تو اسے دوسرے طریقے سے لے جایا جائے گا۔ بڑی مشکل سے یہ اُٹھا اور ساتھ چل پڑا۔

کچھ دُور آئے تو ایک گلی اس بڑی گلی سے ملتی تھی۔ افضل اچانک دوڑ پڑا اور اُس گلی میں چلا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اس کے پیچھے دوڑا۔ افضل ایک اور گلی میں مُڑ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دوڑتے دوڑتے "پکڑو پکڑو" کا شور بھی کیا۔ کئی آدمی آ گئے جن میں دو تین افضل کے تعاقب میں دوڑے۔

وہ غائب ہو گیا۔ کسی نے بتایا کہ اس گھر میں گھس گیا ہے۔ گھر کی عورتوں نے پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ دوڑتا اندر آیا اور سیڑھیوں سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اوپر گئے تو پتہ چلا کہ چھتوں کے اُوپر سے کسی اور گھر میں جا اُترا ہے۔ فرار اور تعاقب کا اچھا خاصا ڈرامہ بن گیا۔ چند ایک ہندوؤں نے ہیڈ کانسٹیبل کا ساتھ دیا۔ افضل کسی اور گلی میں جا نکلا۔ اُدھر سے کسی نے شور کیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اُدھر گیا۔ افضل اِدھر اُدھر چھپتا رہا، آخر پکڑا گیا۔ تماشائیوں کا ہجوم ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

"بھاگے کیوں تھے؟" — میں نے اندر جا کر اس سے پوچھا۔

"خدا کی قسم میرا اس (مقتول) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا" — اس نے ہکلاتی ہوئی زبان سے کہا "میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی

نہیں تھی" — اُس کے منہ سے ایک ایک لفظ بڑی مشکل سے نکلتا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں تم بھاگے کیوں تھے؟"

"آپ مجھ پر پتہ نہیں کیوں شک کر رہے ہیں"

"میں نے ابھی تک کسی شک کا اظہار نہیں کیا" — میں نے کہا — "یار، رشیدہ کہتی ہے کہ تم بڑے دلیر مرد ہو۔ تم تو کچھ بھی نہیں"

"اگر آپ کو مجھ پر کوئی شک نہیں تو مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"مجھے شک نہیں یقین ہے" — میں نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لئے کہا — "تم نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ تم مجرم ہو"

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس کے مُنہ سے کیسی کیسی آوازیں اور کیسے کیسے الفاظ نکلے۔ میری جگہ اگر کوئی اناڑی شہری ہوتا تو وہ بھی اس کے انداز اور اس کی حالت سے یہی رائے دیتا کہ یہ مجرم ہے اور اقبالِ جرم اس کے چہرے پر لکھا ہے۔ پولیس اور تھانے کے خوف سے کسی کی یہ حالت نہیں ہوا کرتی۔ اُس کا فرار اس کے خلاف قابلِ یقین شہادت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دم لے لے۔ میں نے گرم لوہے پر چوٹیں مارنی شروع کر دیں۔

"آپ مجھے جانے دیں" — اس نے منت کے لہجے میں کہا — "آپ جو حکم کریں گے پیش کروں گا۔ میں آپ کو دو گھوڑا بوسکی کا آدھا تھان دوں گا"

دوگھوڑا بوسکی اُس دور کا بہترین اور سب سے زیادہ مہنگا کپڑا ہُوا کرتا تھا جو صرف امیر کبیر گھرانوں میں پہنا جاتا تھا۔ اس کپڑے کا آدھا تھان بہت بڑی رشوت تھی۔

"تم مجھے نقد اور بوسکی کیوں دو گے؟"— میں نے ہنس کر کہا— "حوصلہ کرو یار! اپنا نقصان کیوں اُٹھا رہے ہو؟ میں جو پوچھوں گا وہ سچ سچ بتا دینا"— وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے کہا— "ابھی بتاؤ گے یا رات کو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اُس پر دو گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ میں نے اُس پر کوئی تشدّد نہ کیا۔ وہ تشدّد کے بغیر ہی اذیّت میں مبتلا تھا۔ اس کے اعصاب توڑنے کے لئے یہی اذیّت کافی تھی۔ میں اُس سے سوال پوچھ رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بوسیدہ مکان کی طرح آہستہ آہستہ گر رہا ہے۔ وہ کوئی جاندار بات کرتا تھا تو صرف یہ کہ نقد جتنا مانگو گے اور بوسکی کا آدھا تھان دوں گا۔ آخر اس نے پُورا تھان پیش کیا۔

"پھر بھی تمہیں صحیح بات بتانی پڑے گی"— میں نے کہا۔

"پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟"

"بوسکی کا پُورا تھان لے کر"— میں نے کہا— "اور نقد بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے رشیدہ کے باپ کو کس طرح زہر دیا تھا۔"

میں نے یہ الفاظ پہلی دفعہ کہے تھے۔ وہ اس طرح ہل گیا جس طرح رائفل سے گولی نکلتی ہے تو رائفل کو دھکا لگتا اور فائر کرنے والا ہل جاتا ہے۔ اُس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا اور ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ وہ موسم پسینے والا نہیں تھا۔

"اگر رشیدہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو تو مجھے سچی بات بتا دو"— میں نے کہا— "میں تمہیں بچا لوں گا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے، اسی لئے تمہیں پکڑا ہے۔ اگر مُنہ سے نہیں بولو گے تو پھانسی پاؤ گے۔"

اور وہ بول پڑا۔ اُسے بولنا ہی تھا۔ وہ عادی قاتل تو نہیں تھا، جذبات کے غلبے نے اُس سے جرم کرایا تھا۔ یہ نشہ بہت جلدی اُتر جایا کرتا ہے۔ وہ واقعی دلیر تھا جس نے ایک انسان کی جان لے لی تھی لیکن اس کے بعد اُس کی دلیری اس طرح ختم ہو گئی جس طرح ایسے ہر مجرم کی ختم ہو جایا کرتی ہے اور میں نے اسی طرح اُس کے دل اور اعصاب کو باتوں سے سکون پہنچانا شروع کر دیا جس طرح اس مرحلے میں ہر تھانیدار ملزم کو پہنچایا کرتا ہے۔ اُس نے گہرا سانس لے کر کہا— "میرے پاس یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی طریقہ اختیار کرتا"— میں نے دوستوں کی طرح کہا— "رشیدہ جیسی خوبصورت لڑکی کے لئے میں

تو دو آدمیوں کو زہر پلا دیتا۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ لڑکی تم پر مرتی ہے۔"

زہر کا پیالہ

میری ایسی ہی باتیں تھیں جن کی مدد سے اُس کی زبان رواں ہوگئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد کہتا — "آپ مجھے چھوڑ دیں گے نا؟" — اور میں کہتا — "بوسکی کا تھان لے کر"۔ رشید کا بیان آپ کو سُنا چکا ہوں۔ اس سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس کی اور رشیدہ کی محبت کتنی گہری تھی۔ اس نے اس محبت کو تفصیل سے بیان کیا۔ پھر ماں باپ کے ساتھ جو لڑائی جھگڑے ہوتے وہ بیان کئے۔ اس کا ایک چچا اور دو ماموں بھی اس کے خلاف تھے۔ ان سب نے مل کر طے کیا کہ اُس کی شادی برادری کے ایک گھرانے میں زبردستی کی جاتے اور اگر یہ گڑبڑ کرے تو اسے جائیداد سے محروم کر کے گھر سے نکال دیا جاتے۔

اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ان سب نے مل کر اس کا دماغ خراب کر دیا تھا اور باقی جو کسر رہ گئی تھی، وہ اس کی ماں نے اس طرح پوری کی کہ رشیدہ کو بدچلن اور بدمعاش کہا۔ گھر میں جو عورت آتی اسے وہ کہتی کہ رشیدہ بدچلن ہے اور اس کے بیٹے (ملزم) سے پیسہ کھا رہی ہے۔ اِدھر رشیدہ پتھر بنی ہوتی تھی۔ افضل اُسے کہتا تھا

کہ تم بدنام ہو رہی ہو، باپ کی فکر نہ کرو اور شادی کر لو مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ ان حالات اور جذبات کے بگولے میں آکر افضل پر وہ مخصوص پاگل پن سوار ہوگیا جو اپنی یا کسی دوسرے کی جان لئے بغیر نہیں ٹلا کرتا۔ اس کا نتیجہ خودکشی ہوتا ہے یا قتل یا دونوں۔

اُس نے جب ایک حکیم سے ایک بلّی کو مارنے کے لئے زہر لیا جو اُس کے کبوتروں کو تنگ کرتی تھی، اُس وقت وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ یہ زہر خود کھائے گا یا رشیدہ کے باپ کو کھلائے گا۔ اُس کے گھر ایک بھی کبوتر نہیں تھا، نہ کسی بلّی کو مارنے کی ضرورت تھی۔ حکیم نے اسے چار آنے کا زہر دے کر کہا — "یہ صرف چُوہے اور بلّی کو فوراً مار سکتا ہے۔ میں زیادہ تیز چیز نہیں دے سکتا۔"

اُس نے زہر کی پُڑیا جیب میں رکھ لی۔ جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ اپنے آپ اس کے استقبال کو آگے ہو جاتا ہے۔ افضل نے رات کو فیصلہ کیا کہ رشیدہ کے ساتھ آخری ملاقات کر کے اُسے کہے گا کہ اُس نے اُس کے ساتھ شادی نہ کی تو وہ خودکشی کر لے گا، مگر اس سے پہلے اُس کی ملاقات رشیدہ کے باپ سے ہوگئی۔ یہ بدقسمت انسان افضل کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ افضل دکان میں اکیلا تھا۔ رشیدہ کے باپ نے رُک کر اُسے سلام کیا۔ افضل اُٹھ کر اُسے ملا اور دکان میں لے گیا۔ اُسی وقت افضل کا نوکر اس کے لئے گھر سے کھانا لے کر پہنچ گیا۔ کھانے کے ساتھ لسّی بھی تھی۔

"میں نے رشیدہ کے باپ کو دیکھا تو میرے دل میں یہ بات چاقو کی طرح اُتر گئی کہ اس شخص کو رشیدہ نے اپنے اور میرے درمیان دیوار کی طرح کھڑا کر رکھا ہے۔ اس میں اس شخص کا قصور نہیں تھا لیکن جب تک یہ زندہ تھا ہم ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے تھے"
اُس نے کہا — "زہر میری جیب میں تھا اور گھر سے دہی کی میٹھی لسّی آگئی تھی۔"

نوکر نے روزمرہ کی طرح کھانا دوکان کے پچھلے کمرے میں رکھا اور چلا گیا۔ افضل کو ایک سہولت یہ بھی ملی کہ اس کا باپ دکان میں نہیں تھا۔ افضل نے رشیدہ کے باپ کے ساتھ بڑے احترام اور برخورداری سے باتیں کیں اور اس کی "خاطر تواضع" کے لئے لسّی کا گلاس لینے اندر چلا گیا۔ زہر کی پُڑیا لسّی میں ڈالی اور کسی چیز سے زہر لسّی میں ہلا ہلا کر ملا دیا۔ رشیدہ کے باپ نے لسّی پینے سے بہت انکار کیا اور کہا — "بیٹا! یہ تمہارے لئے آئی ہے، میں نہیں پیوں گا"۔ مگر افضل کے اصرار اور موت نے اُسے لسّی پلا دی۔ لسّی گاڑھی اور میٹھی تھی اور زہر پھیکا تھا۔

بعد میں حکیم کی گواہی لیتے معلوم ہوا تھا کہ یہ زہر کڑوا یا تُرش نہیں تھا۔ میں نے حکیم کو بتایا تھا کہ مقتول موت سے تین چار دن پہلے سر میں گرانی اور معدے میں جلن محسوس کرتا رہا اور اس کی صحت ان تین چار دنوں میں بہت گر گئی تھی۔ حکیم نے بتایا کہ یہ اس

زہر کے اثرات تھے اور ملزم نے جتنی مقدار میں زہر دیا تھا، اس سے تین چار دن بعد ہی موت واقع ہونی چاہیئے تھی۔

مقتول نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلا گیا۔ افضل نے یہ دن بڑی ہی اذیّت ناک بے چینی میں گزارے۔ اسے پچھتاوا بھی ہوتا اور جب وہ دیکھتا کہ رشیدہ کا باپ مرا نہیں تو اسے خوشی ہوتی اور پھر اسے افسوس بھی ہوتا کہ وہ مرا نہیں، اور جب اسے اطلاع ملی کہ وہ مر گیا ہے تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ اس لئے بھی خوش تھا کہ وہ مر گیا ہے اور اس لئے بھی کہ وہ اس کے دیتے ہوئے زہر سے نہیں مرا، مگر اسے دوسرے دن پتہ چل گیا کہ وہ زہر سے مرا ہے۔ اس خبر سے افضل کا سکون اور چین ختم ہو گیا۔ اسے ہر طرف پولیس اور پھانسی کا رسّہ نظر آنے لگا۔ یہ قدرتی ردِّ عمل تھا۔ گناہ بول رہا تھا اور ضمیر انتقام پر اُتر آیا تھا۔

اسی ذہنی کیفیت میں ہیڈ کانسٹیبل نے اسے جا کر کہا کہ میرے ساتھ تھانے چلو۔ افضل کی دلیری اور مردانگی ختم ہو گئی۔ قتل جیسے بھیانک جُرم نے اس کی عقل مار دی۔ اس نے فرار ہو کر ثابت کر دیا کہ وہ مجرم ہے۔ میں نے دفعہ ۱۶۴ کے تحت مجسٹریٹ سے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کرا لیا۔ وہ سیشن کورٹ میں جا کر اس بیان سے منحرف ہو گیا، مگر ایک چیخ تھی اور ایک قہقہہ جو یہ کہانی سناتے بھی مجھے سنائی دے رہا ہے۔ سیشن کورٹ میں کیس کی سماعت ہو رہی تھی۔

رشیدہ اپنے بھائیوں اور سوتیلی ماں کے ساتھ گواہ کی حیثیت سے کورٹ کے باہر کھڑی تھی۔ میں ان کے قریب کھڑا تھا۔ رشیدہ پر خاموشی طاری رہتی تھی۔

کھڑے کھڑے رشیدہ نے برقعہ اُتار ڈالا اور اتنی زور سے چیخ ماری کہ دل دہل گئے، پھر اُس نے چیخوں کی طرح قہقہہ لگایا اور برقعہ پھینک کر دوڑ پڑی — وہ پاگل ہو گئی تھی۔

سیشن کورٹ نے افضل کو عمر قید دی تھی لیکن ہائی کورٹ نے اسے اپیل میں شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

دوسری بیوی

آپ مجھے بڑا قابل اور اُستاد سراغرساں سمجھتے ہوں گے لیکن میں قابل بھی نہیں اور اُستاد بھی نہیں تھا۔ مجھ میں خوبی یہ تھی کہ میں اپنے فرائض کے ساتھ اور اُن لوگوں کے ساتھ جو میرے پاس سائل یا مستغیث یا مشتبہ کی حیثیت سے آتے تھے، عزت و احترام سے پوری طرح دیانتداری اور خلوص سے پیش آتا تھا۔ اگر آپ مجھے اب بھی قابل اور اُستاد سراغرساں سمجھتے ہیں تو میں آپ کو اپنی ایک احمقانہ تفتیش کی کہانی سناتا ہوں۔ میں واردات کی رپورٹ کرنے والوں اور گواہوں وغیرہ کی حماقتوں کے جال میں آگیا تھا اور اس جال میں مجھے اپنے خلوص، فرض شناسی اور دیانتداری نے بھی پھنسایا تھا۔

وہ چھوٹا سا ایک قصبہ تھا جسے اِرد گرد کے دیہات والے شہر کہتے تھے کیونکہ اس میں سے پکی سڑک اور ریلوے لائن گزرتی تھی اور یہاں ریلوے سٹیشن بھی تھا، ورنہ آج کل کے معیار کے مطابق یہ ایک

بڑا گاؤں تھا۔ ایک روز اس قصبے کا ایک آدمی تھانے میں آیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک بیٹا بھی تھا جس کی عمر چودہ پندرہ سال ہوگی۔ یہ آدمی مسلمان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جوان بیٹی لاپتہ ہے۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ کسی کے ساتھ نکل گئی ہوگی لیکن اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ لڑکی شادی شدہ ہے اور اپنے خاوند کے گھر سے لاپتہ ہے۔ میں اسے کوئی گھریلو جھگڑا سمجھا اور یہ ارادہ کیا کہ رپورٹ درج نہیں کروں گا۔ اگر یہ دو گھروں کا جھگڑا ہُوا تو ان کی صلح وصفائی کرا دوں گا۔ میں اسے جھگڑا اس لئے سمجھ رہا تھا کہ لڑکی خاوند کے گھر سے لاپتہ ہُوئی تھی لیکن خاوند اس آدمی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔

"آپ کی بیٹی کا خاوند آپ کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے شک ہے کہ میری بیٹی کو اُسی نے غائب کیا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

اُس نے جو تفصیل سُنائی وہ مختصراً یوں ہے کہ اس خاوند کی یہ دوسری بیوی تھی۔ اُس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ اسے حلیم کہہ لیں۔ اُس نے آٹھ نو سال گزرے پہلی شادی کی تھی لیکن اولاد نہ ہُوئی۔ اولاد کی خاطر اُس نے اِس آدمی سے جو رپورٹ درج کرانے آیا تھا، اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ لڑکی کے باپ نے رشتہ دینے کا وعدہ کر دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس نے اپنی اٹھارہ انیس سال کی عمر کی بیٹی کا رشتہ بتیس تینتیس سال کی عمر کے آدمی کو صرف اس لئے دے دیا کہ اُس آدمی کے مالی

حالات بڑے اچھے تھے اور وہ جس مکان میں رہتا تھا وہ اُس کا اپنا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے الگ رہتا تھا۔ وہ حویلی بھی اس خاندان کی اپنی تھی۔

حلیم نے رشتہ لینے کی یہ شرط رکھی تھی کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق نہیں دے گا اور اس کے حقوق پورے کرتا رہے گا۔ لڑکی کے ماں باپ اپنی بیٹی کا رشتہ حلیم کو نہیں بلکہ اُس کی اچھی آمدنی اور مکان کو دے رہے تھے، اس لئے انہوں نے حلیم کی شرط منظور نہ کی اور کہا کہ پہلے وہ پہلی بیوی کو طلاق دے اور یہ شرط بھی رکھی کہ مکان لڑکی کے نام کر دے اور یہ بھی کہ وہ دس ہزار روپیہ حق مہر کے علاوہ ایک سو روپیہ ماہوار لڑکی کا خرچ لکھ کر دے۔

حلیم نے یہ شرائط مان لیں۔ اُسے اولاد کے لئے دوسری بیوی کی ضرورت تھی اور لڑکی بہت خوبصورت بھی تھی۔ وہ نوجوان بھی تھی۔

حلیم نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی اور اس آدمی کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی۔ مکان بھی لڑکی کے نام کر دیا، دس ہزار روپیہ حق مہر اور ایک سو روپیہ ماہوار خرچ بھی لکھ دیا۔ اُس زمانے میں دس ہزار روپیہ اور ایک سو روپیہ ماہوار بہت ہی زیادہ رقمیں تھیں۔ پانچ چھ افراد کا کنبہ ایک روپیہ روزانہ میں بڑی اچھی روٹی کھا سکتا تھا۔ ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والا آدمی امیر سمجھا جاتا تھا۔

باپ کی رپورٹ کے مطابق اُس کی بیٹی نیک، سلیقہ شعار، بے زبان اور غلاموں کی طرح زندگی گزارنے والی تھی۔ اُس نے اس

شادی کو قبول کیا اور خاوند کی خدمت اور فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ رہنے دی، مگر حلیم لڑکی کو میکے نہیں جانے دیتا تھا۔ شادی کو ایک سال پہلے ہُوئی تھی۔ حلیم نے لڑکی کو ایک سال میں صرف دو مرتبہ گھر آنے کی اجازت دی اور وہ بھی [illegible] دن کے لئے۔ لڑکی کے ساتھ اُس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ اُس نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ لڑکی کے والدین اور بھائی وغیرہ اُس کے گھر آکر لڑکی سے مل سکتے ہیں اور جتنے دن چاہیں رہ سکتے ہیں۔ دونوں کے گھر اسی قصبے میں تھے اور کچھ دُور دُور تھے۔

حلیم کا یہ رویّہ میرے لئے قابلِ فہم تھا۔ اُس نے دراصل مکان کے عوض لڑکی خریدی تھی۔ لڑکی اب اُس کی ملکیت تھی۔ ماں باپ نے لڑکی کی جو قیمت مانگی تھی، وہ انہیں مل گئی تھی۔

دوسری بیوی لاپتہ

لڑکی کے باپ نے بتایا کہ سات آٹھ دن گزرے اُس کی بیوی (حلیم کی ساس) حلیم کے گھر اپنی بیٹی سے ملنے گئی۔ اُسے حلیم اکیلا گھر ملا۔ لڑکی نہیں تھی۔ ماں نے اپنی بیٹی کے متعلق پوچھا تو حلیم نے بتایا کہ محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ ماں انتظار کرتی رہی۔ اس کی بیٹی واپس نہ آئی۔ حلیم نے تین چار بار کہا کہ وہ چلی جائے۔ اس کی بیٹی آئے گی تو وہ اُسے اُس کے گھر (میکے) بھیج دے گا۔ ماں واپس آگئی۔

دوسرے دن لڑکی کا چھوٹا بھائی اپنی بہن سے ملنے گیا۔ بہن گھر نہیں تھی۔ حلیم نے اس لڑکے کو بھی یہی بتایا کہ اس کی بہن محلے میں کسی کے گھر گئی ہے اور ذرا دیر سے آئے گی۔ ایک دو روز بعد لڑکی کا باپ حلیم کے گھر گیا۔ اسے بھی حلیم نے یہی بتایا کہ لڑکی محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔

باپ نے حلیم سے کہا کہ وہ اُسے بُلا دے یا پڑوسیوں کے کسی بچّے سے کہے کہ دیکھے کہ وہ کس گھر میں ہے۔ حلیم نے اُسے کہا کہ وہ چلا جائے۔ باپ نے محسوس کیا کہ حلیم کچھ پریشان اور اُکھڑا اُکھڑا سا تھا، اور اُس نے جس انداز سے لڑکی کے باپ سے کہا کہ وہ چلا جائے وہ مشکوک سا تھا۔ باپ چلا گیا اور لڑکی کی ماں کو بتایا کہ حلیم کا رویّہ ٹھیک نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اُس نے لڑکی کو اپنے گھر میں بھی والدین سے ملنے سے روک دیا ہے اور لڑکی شاید کمرے میں ہوتی ہے اور حلیم کہہ دیتا ہے کہ محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔

ماں طیش میں آگئی۔ وہ شام کے بعد جب رات اندھیری ہو چکی تھی، حلیم کے گھر چلی گئی۔ وہاں تالا لگا ہُوا تھا۔ ماں پڑوسیوں کے ہاں گئی۔ وہاں عورتوں نے لڑکی کی ماں سے پوچھا کہ اُس کی بیٹی میکے میں ہے؟ ماں نے بتایا کہ نہیں وہ تو اُسی سے ملنے آئی تھی لیکن تالا لگا ہُوا ہے۔ اُسے پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ کئی دنوں سے نظر نہیں آرہی اور سب سمجھتی ہیں کہ اپنے گھر گئی ہے۔ ماں سمجھی کہ اس

کی بیٹی حلیم کے والدین کے گھر گئی ہوگی۔ ماں وہاں گئی اور حلیم کی ماں سے اپنی بیٹی کے متعلق پوچھا۔ حلیم کی ماں اُس پر لوٹ پڑی۔

"تم نے اپنی بیٹی ہمیں دی تھی؟" — حلیم کی ماں نے کہا — "اس نے تو ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ اتنی اچھی بیوی کو طلاق دے دی۔ ہم حلیم سے کہہ کہہ کے تھک گئے کہ اپنا علاج معالجہ کراؤ، کسی پیر فقیر کی مریدی کرو، کسی خانقاہ پر جا ماتھا رگڑو، اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں لیکن وہ دوسری شادی کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ ہماری ایک نہ سُنی۔ ادھر تم اپنی بیٹی دینے کو تیار بیٹھی تھیں۔ مکان لکھوایا اور بیٹی دے دی۔"

دونوں عورتوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہوتی اور پتہ چلا کہ نہ حلیم ماں باپ کے گھر جاتا ہے نہ اُس کی دوسری بیوی کبھی گئی ہے۔ اس سے حلیم کے خلاف لڑکی کے والدین کو شک ہوا کہ حلیم نے کسی وجہ سے لڑکی کو غائب کر دیا ہے۔

لڑکی کے باپ نے اپنے دوستوں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ تھانے رپورٹ کر دو۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ اُسے حلیم پر ایسا شک کس بنا پر ہوا ہے؟

"وہ پہلی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے دوسری شادی صرف اولاد کی خاطر کی ہے۔ ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ اُس نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس لڑکی میں بھی اولاد پیدا

کرنے کی صلاحیت نہیں۔ وہ مکان ہماری بیٹی کے نام کر چکا تھا۔ حق مہر بھی بہت زیادہ تھا اور ماہوار خرچ بھی زیادہ۔ اُس نے یہی بہتر سمجھا ہو گا کہ اس لڑکی کو طلاق دی تو بہت مہنگی پڑے گی اور مکان بھی ہاتھ سے نکل جائے گا، اس لئے اسے ٹھکانے لگا دو۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ تیسری شادی کر لے گا .... اُس پر اپنے والدین کا دباؤ بھی پڑ رہا ہے۔ وہ حلیم کی پہلی بیوی کے قریبی رشتہ دار ہیں۔"

مجھے یہ چار دیواری کی دُنیا کا ایک معمولی سا ڈرامہ نظر آتا تھا۔ کسی لڑکی کو غائب کر دینا یا قتل کرا دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسی وارداتیں راجوں مہاراجوں اور بہت بڑے جاگیرداروں کے ہاں ہوتی ہیں۔ میں نے رپورٹ لکھنے کی بجائے حلیم سے بات کرنا بہتر سمجھا۔ ایک کانسٹیبل کو پرائیویٹ کپڑوں میں حلیم کے پتے پر بھیجا کہ کسی اور کو بتائے بغیر اُسے تھانے لے آئے۔ حلیم کے سُسر اور سُسر کے بیٹے کو میں نے کانسٹیبلوں کے کمرے میں بھیج دیا اور میں کسی اور کام میں مصروف ہوگیا۔

حلیم کا گھر دُور نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد کانسٹیبل آگیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ حلیم نہیں ملا۔ اس کانسٹیبل نے باریک کپڑے کی قمیض پہن رکھی تھی۔ ویسے ہی میری نظر اُس کی جیب پر پڑی۔ پانچ روپے کا ایک نوٹ باریک کپڑے میں سے جیب میں پڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کی جیب سے یہ نوٹ نکال کر اپنے پاس رکھ لیا

اور اُسے کہا ــــ "جاؤ اور اُسے ساتھ لے آؤ اور واپس آکر مجھ سے یہ نوٹ لے لینا۔"

میں نے اُس کی بددیانتی پکڑ لی تھی۔ اس پر میں نے غصے کا اظہار نہ کیا۔ وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ ایک گھنٹے سے کم عرصے میں وہ حلیم کو ساتھ لے آیا۔ میں نے کانسٹیبل کے سامنے حلیم سے پوچھا کہ وہ پہلے کیوں نہیں آیا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ گھر نہیں تھا۔

میں نے پانچ روپے کا نوٹ اُس کی طرف بڑھا کر کہا ــــ "کیا تم پولیس کو دھوکہ دے سکتے ہو؟ کتنی بار پانچ روپے دیتے رہتے؟ ..... صرف دو بار۔ تیسری بار ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے یہاں آجاتے۔ یہ لو اپنے پانچ روپے۔"

کانسٹیبل کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے گھورا اور وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ حلیم نے مجھ سے پانچ کا نوٹ لے لیا۔

مجرم یا مظلوم؟

"تمہاری دوسری بیوی کہاں ہے؟" ــــ میں نے اُسے اپنے دفتر میں بٹھا کر پوچھا۔

اُس کا جواب صرف یہ تھا کہ اُس کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں

اور ہونٹ کھل کر کانپنے لگے۔ میرے حوصلہ دینے پر بھی اُس کے منہ سے بات نہ نکلی۔

"تم تھانے کیوں نہیں آئے تھے؟" ــــ میں نے پوچھا۔ "کانسٹیبل کو پانچ روپے دے کر کیوں یہ کہلوایا تھا کہ جاؤ کہہ دینا وہ گھر نہیں ہے؟"

اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔

میں نے کہا ــــ "کہہ دو محلے میں کسی کے گھر گئی ہوئی ہے۔"

وہ چپ رہا۔ اُس نے کانسٹیبل کو پانچ روپے کا نوٹ جو دیا تھا وہ اُس کی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پولیس کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے جو بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔ اُس زمانے میں کانسٹیبل یا عدالت کے ہرکارے کو ٹالنے کے لئے عام لوگ آٹھ آنے اور امیر لوگ ایک روپیہ دیا کرتے تھے۔ پانچ روپے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اُس کا جُرم معمولی نہیں، اور اگر جُرم معمولی ہے تو یہ بہت زیادہ گھبرا گیا ہے۔

"ایک رات حوالات کے اندر گزارو" ــــ میں نے کہا ــــ "کل صبح تک میرا خیال ہے تم بولنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

وہ اس طرح بدکا اور اُس کی نظریں مجھ پر جم گئیں جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار اُس کے جسم سے لگا دیئے ہوں۔ میں اُٹھنے لگا تو اُس نے اس ڈر سے لپک کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے کہ میں اُسے حوالات میں بند کرنے کو اُٹھا ہوں۔ اُس نے پہلے سر ہلایا پھر سسکی

لینے کی طرح بولا — "ذرا بیٹھ جائیں۔ میری بات سُن لیں۔ میں مجرم نہیں مظلوم ہوں" — اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ" — میں نے اُسے بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ کر کہا — "یہ پولیس سٹیشن ہے جہاں پتھر بھی بول پڑتا ہے کہ اُسے فلاں آدمی نے اُٹھا کر فلاں آدمی کے سر پر مارا تھا۔ تم اگر مجرم ہو تو سب کچھ بتا دو اور اگر مظلوم ہو تو تمہاری اتنی مدد کروں گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے" — میں نے آگے ہو کر رازداری سے کہا — "اگر اپنا جرم مجھے پریشان کئے بغیر سنا دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ میرے ساتھ دوستی کر لو۔ میرا خیال ہے تم نے مظلوم ہو کر جرم کیا ہے۔ مجھے ایسے آدمی کے ساتھ بہت ہمدردی ہوتی ہے" — میں نے آہستہ سے پوچھا — "بیوی کو قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں" — وہ ہڑبڑا کر بولا — "وہ خود ہی کہیں بھاگ گئی ہے۔ وہ مجھے دھوکہ دے گئی ہے"

"وہ تو سُنا ہے بڑی فرمانبردار اور نیک لڑکی تھی اور اُس نے تمہیں دل سے قبول کر لیا تھا"

"میری پہلی بیوی فرمانبردار اور نیک تھی" — اُس نے کہا — "یہ دوسری اصل شیطان ہے۔ میں اسے نیک اور فرمانبردار سمجھا تھا لیکن اس نے پہلے ایک ماہ میں اپنی حرکتوں سے ثابت کر دیا کہ اسے میرے گھر اور میری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے مکان اس کے

نام کر دیا تھا پھر اسے روپیہ پیسہ دیتا رہتا کہ خوش رہے۔ اسے بڑے قیمتی کپڑے دیتا رہا مگر اس کا رویّہ میرے خلاف رہا اور دن بدن بگڑتا رہا۔ میں نے اس پر ذرا سختی شروع کر دی اور اسے اُس کے ماں باپ کے گھر جانے سے روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی ماں اچھی نیّت کی عورت نہیں، وہ اسے غلط سبق دیتی ہوگی، مگر لڑکی کا رویّہ بگڑتا رہا....

"کوئی تین ماہ بعد اس نے مجھے یہ الفاظ کہہ دیئے — 'میں نے آپ کو دل سے قبول نہیں کیا۔ میں نے اپنے ماں باپ کا حکم مانا ہے' — وہ تو یہ بھی کہتی تھی کہ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔ میں نے اس کی ماں سے بھی اور باپ سے بھی کہا کہ اپنی بیٹی کو سمجھائیں ورنہ میں مکان کی رجسٹری اپنے نام کرا لوں گا۔ اس کی ماں نے کہا کہ مکان کی رجسٹری تو اس کے پاس ہے۔ اب یہ کاغذات اسے نہیں مل سکتے۔ میں نے دیکھا کہ اس عورت کا رویّہ بھی دشمنوں والا تھا۔ مکان کی رجسٹری اس نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ میرے سُسر کا رویّہ کچھ بہتر تھا لیکن ماں بیٹی پر اس شخص کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں اولاد کی خاطر جال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو طلاق دینے کی سوچی تو خیال آیا کہ مکان بھی دے چکا ہوں اور دس ہزار روپیہ حق مہر لکھ دیا ہے۔ میں نے غصّے میں آکر اس کی پٹائی شروع کر دی....

"کوئی پندرہ سولہ دن گزرے میں صبح جاگا تو بیوی ساتھ والے پلنگ پر نہیں تھی۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ خیال تھا کہ غسل خانے میں ہو

گی مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ خود گئی ہے، خود ہی آ جائے گی، میں اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ میں نہ گیا۔ پانچ روز بعد اس کی ماں آئی۔ وہ آتی رہتی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں اُس سے پوچھتا کہ اُس کی بیٹی کہاں ہے، اُس نے مجھ سے یہی سوال پوچھا۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے باداموں وغیرہ کی کوئی چیز بنا کر لاتی تھی۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہ تم بھی کھایا کرو، اس میں بڑی طاقت ہے۔ میں نے اس عورت کی باتیں غور سے سُنیں۔ اس کے لہجے اور انداز میں مجھے کوئی شرارت نظر نہیں آئی تھی لیکن اس عورت کا کوئی اعتبار بھی نہ تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کی بیٹی محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ وہ کچھ دیر انتظار کر کے چلی گئی....

"دوسرے دن اس کا بھائی آ گیا۔ وہ بھی اپنی بہن سے ملنے آیا تھا۔ مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ میں نے اسے بھی یہی کہا کہ اس کی بہن محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ اس کی بہن اپنے گھر کب گئی تھی۔ وہ چودہ پندرہ سال کا لڑکا تھا، میری باتوں میں آ گیا۔ اُس نے دو ماہ پہلے کا بتایا کہ اُس کی بہن اپنے گھر گئی تھی۔ مجھے یہ شک تھا کہ اس کی ماں بڑی چالاک ہے، اس نے اپنی بیٹی کو مجھ سے چوری چھپے اپنے گھر بلا کر چھپا لیا ہے اور یہ اس کی کوئی خطرناک چال ہوگی مگر لڑکے سے پتہ چلا کہ میری بیوی ماں باپ کے پاس نہیں گئی۔ وہ بھاگ گئی تھی۔ بھاگنے کی وجوہات بڑی

صاف ہیں۔ اُس نے مجھے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ میں اُس پر اتنی سختی کرتا تھا کہ اُسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ لڑکی ہوشیار اور طبیعت کی تیز ہے۔ اُسے بھگانے میں اس کی ماں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے مکان اپنی لڑکی کے نام لکھوا لیا ہے....

مکان دیا بیٹی لی

"اگلے روز اُس کا باپ آیا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے آیا تھا۔ اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مجھ پر شک ہے۔ میں نے اسے بھی بتایا کہ اس کی بیٹی محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ اس نے کہا — "تم کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ہمیں اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت نہیں۔ اس کی ماں آئی، بھائی آیا، اب میں آیا ہوں۔ تم سب کو ایک ہی جواب دے رہے ہو کہ محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ میں شام تک یہیں رہوں گا۔ وہ آ جائے گی" — میرے لئے یہ پریشانی کچھ کم نہیں تھی کہ میری بیوی لاپتہ ہو گئی تھی۔ اس کے باپ نے مجھے مشتبہ سمجھ کر رُعب سے بات کی تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے کہا — "گھر کے سارے کمرے دیکھ لو۔ اُوپر چلے جاؤ۔ تمہیں بیٹی کہیں نظر آ جائے تو اسے دو چار دنوں کے لئے گھر لے جاؤ"....

"اس نے ایک بار پھر کہا کہ میں شام تک ٹھہروں گا۔ میں نے

کہا ۔۔۔ "میں تمہیں دو منٹ اور یہاں نہیں ٹھہرنے دوں گا۔ میں کام سے جا رہا ہوں"۔۔۔ اس نے غصّے کا جواب غصّے سے دیا تو میں نے جل کر کہا ۔۔۔ "اپنی بیٹی پر اب تمہارا کوئی حق نہیں۔ میں نے پورا مکان دے کر اسے تم سے خریدا ہے۔ یہ میری مہربانی ہے کہ تمہیں اپنے گھر میں داخل ہونے دیتا ہوں"۔۔۔ وہ واہی تباہی بکتا نکل گیا .... اور آج آپ نے بلالیا ہے۔ میرے دل میں جو کچھ تھا وہ آپ کو سنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"کسی پر شک ہے تمہیں؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی۔ اسے کوئی اٹھا کر نہیں لے گیا۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔"

"تم نے پہلے روز ہی اپنی ساس سے کیوں نہ کہہ دیا کہ تمہاری بیوی صبح سے غائب ہے؟"۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔۔۔ "تمہیں جب یقین ہو گیا تھا کہ تمہاری بیوی غائب ہے تو تم اس کے ماں باپ کے پاس کیوں نہ چلے گئے؟"

"میں سوچتا رہا۔ اتنے میں اس کی ماں آگئی"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "اس نے جب بتایا کہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے آئی ہے تو میں چکرا گیا۔ مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔"

میں نے اس پر بہت جرح کی۔ اسے بہت چکّر دیئے۔ اس کی

نفسیات سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی نیت کو بھانپا۔ میں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ شخص اتنا دلیر اور چالاک نہیں جتنا احمق ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ اسے جب یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی اتنے دنوں سے لاپتہ ہے تو اس نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہ دی؟ اس نے طرح طرح کی احمقانہ باتیں کر کے مجھے اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتا تھا کہ اپنی زبان سے یہ کہنے میں کہ اس کی بیوی بھاگ گئی ہے وہ اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ وہ اپنی پہلی بیوی سے بھی نادم تھا۔ وہ دوسری بیوی کے فرار کو چھپانے کی کوشش میں تھا اور یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس کی بیوی گھوم پھر کر واپس آجائے گی۔

میں نے حلیم کو دفتر سے نکال کر ایک اور کمرے میں بھیج دیا اور اس کے سسر کو بلایا۔ اسے خبردار کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے آیا ہے، اسے ایک بار پھر سوچ لینا چاہیئے کیونکہ رپورٹ غلط ثابت ہوئی اور بیٹی اس کے اپنے گھر سے برآمد ہو گئی یا یہ پتہ چل گیا کہ اپنی بیٹی کو اس نے خود یا اس کی ماں نے اپنے داماد کو پریشان کرنے کے لئے کہیں چھپا رکھا تھا تو دونوں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

اس شخص نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اپنی بیٹی کو انہوں نے خود غائب نہیں کیا۔ ان کے داماد نے اسے غائب کیا ہے۔ اسے ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں نے اس کے داماد کو بھی بلا رکھا ہے

میں نے اسے کہا کہ وہ گھر جائے اور اپنی بیوی سے ایک بار پھر مشورہ کر لے اور اُسے بتائے کہ رپورٹ درج کرانے کا نتیجہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

وہ چلا گیا۔ میں نے حلیم کو بلا کر ڈرایا دھمکایا اور بہت کوشش کی کہ اس نے اگر بیوی کو خود اِدھر اُدھر کر دیا یا ٹھکانے لگا دیا ہے تو مجھے بتا دے۔ وہ رونے پر آ گیا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ میری بیوی اپنی مرضی سے یا اپنی ماں کی کوشش سے لاپتہ ہُوئی ہے۔ اُسے تلاش کیا جائے۔

میں اتنا سمجھ گیا تھا کہ حلیم میں اپنی بیوی کو قتل کرنے اور لاش غائب کرنے کی ہمت نہیں۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ اس کے پاس پیسہ تھا جس سے وہ یہ جُرم کرائے کے قاتلوں سے کرا سکتا تھا۔ تاہم میں ابھی تک اسے گھریلو جھگڑا سمجھ رہا تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ یہ لوگ صلح و صفائی کر کے پولیس اور عدالت کے چکر سے بچ جائیں۔ میں نے حلیم سے کہا کہ وہ کل پھر میرے پاس آئے، شاید اس کی بیوی واپس آ جائے۔ وہ بھی چلا گیا

لاش جوان لڑکی کی تھی

دو دِن ان میں سے کوئی بھی تھانے نہ آیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ

انہوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ تیسرے دن دو میل دُور کے ایک گاؤں کا نمبردار تھانے میں آیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گاؤں سے تھوڑی ہی دُور ویرانے میں ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے جو زمین میں دبی ہوئی تھی۔ بھیڑیوں وغیرہ نے نکال لی ہے اور کچھ کھا لی ہے۔

میں اُسی وقت روانہ ہو گیا۔

لاش عورت کی تھی۔ خراب ہو چکی تھی۔ ابھی سوجی ہُوئی تھی، گلی سڑی نہیں تھی۔ گیدڑوں اور بھیڑیوں نے اُسے تھوڑی ہی دیر پہلے نکالا تھا۔ کئی جگہوں سے گوشت کھایا ہُوا تھا۔ چہرہ ابھی محفوظ تھا۔ جسم پر خون نہیں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے تیز دھار آلے سے نہیں مارا گیا۔ اسے درندوں نے جہاں سے نکالا تھا وہ گہرا گڑھا نہیں تھا۔ رات طوفانی بارش برسی تھی۔ بہتے پانی نے گڑھے سے مٹی بہا دی تھی جس سے لاش ننگی ہو گئی اور گیدڑ وغیرہ پہنچ گئے۔ لاش کے کپڑے درندوں نے چیتھڑے بنا دیئے تھے۔ میں نے کپڑے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہ عورت دیہاتی نہیں تھی۔ اُس کے پاؤں میں شہری سینڈل تھے جو صرف شہروں میں پہنے جاتے تھے۔

میں نے لاش اُٹھوائی اور پوسٹ مارٹم کا انتظام کرایا۔ مجھے حلیم کی بیوی کا خیال آ گیا۔ یہ لاش میرے لئے مصیبت بننے والی تھی کیونکہ منادی کرا کے اس کی شناخت کرائی تھی۔ میرے تھانے میں حلیم کی بیوی

کے سوا کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں آتی تھی۔ اگر یہ حلیم کی بیوی نہیں تھی تو مجھے دوسرے تھانوں سے پتہ کرنا تھا کہ کسی کے ہاں کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ آئی ہوگی۔ میں لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا کر تھانے چلا گیا۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ حلیم، اُس کے سُسر اور ساس کو تھانے لے آئے۔

لاش کو دیر سے آنا تھا۔ حلیم وغیرہ پہلے پہنچ گئے۔ میں لاش کے کپڑوں کے چیتھڑے اور سینڈل لے آیا تھا۔ پہلے حلیم کو اندر بُلایا اور اُسے چیتھڑے اور سینڈل دکھاتے۔ اُس نے کہا کہ اگر ایک چیتھڑا دھو کر اُسے دکھایا جائے تو پہچاننے میں آسانی ہوگی۔ کپڑے کیچڑ سے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ میں نے سب سے بڑا ٹکڑا ایک کانسٹیبل کو دیا کہ اسے دھولائے۔ یہ پھولدار کپڑا تھا اور ریشمی تھا۔

کپڑا دھل کر آیا تو حلیم نے پہچان لیا۔ کہنے لگا کہ اُس رات اُس کی بیوی نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سینڈل بھی اُس نے پہچان لئے۔ لاش کے ساتھ زیور کی ایک بھی چیز نہیں تھی۔

پھر میں نے حلیم کی ساس کو بلایا۔ اُس نے دُھلا ہُوا چیتھڑا دیکھتے ہی کہہ دیا ___ "یہ میری بیٹی کے سُوٹ کا کپڑا ہے" ___ لاش کے ساتھ شلوار بھی اسی کپڑے کی تھی۔ سینڈل کے متعلق اُس نے کہا کہ اس کی بیٹی اسی قسم کے سینڈل پہنتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اُس کا خاوند دوڑا آیا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی

بہت کوشش کی لیکن وہ بین کرتی اور حلیم کو گالیاں دیتی تھی۔

میں لاش کے انتظار میں تھا مگر ہسپتال سے پیغام آیا کہ لاش ضلعے کے ہسپتال میں بھیجنی پڑے گی۔ میں نے حلیم اور اُس کی ساس اور سُسر کو گھر چلے جانا کو کہا اور انہیں بتایا کہ میں انہیں کل بلا لوں گا۔ میں لاش کو بیس بائیس میل دُور بھیجنے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔

لاش دوسری بیوی کی

لاش دوسرے دن شام کو واپس آئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ یہ لاش جوان لڑکی کی ہے۔ اسے مرے ہوئے پندرہ سے بیس دن گزر گئے ہیں۔ موت کا باعث گلا گھونٹنا لکھا گیا تھا۔ میں گردن پر نشان نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ گردن سوجی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی سُوجا ہُوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ میں نے حلیم، اُس کی ساس اور سُسر کو بلا لیا۔ تینوں نے لاش کا چہرہ دیکھا۔ سب سے پہلے ماں نے کہا ___ "یہ میری بیٹی کی لاش ہے" ___ مقتولہ کے باپ نے بھی تائید کر دی اور پھر حلیم نے بھی کہہ دیا کہ اُس کی بیوی کی لاش ہے۔ میں اس لئے مان گیا کہ یہ حلیم کی بیوی کی لاش ہے کہ اس لڑکی کو لاپتہ ہُوئے پندرہ سولہ دن گزرے تھے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ یہ تھی کہ مقتولہ کو مرے پندرہ سے بیس روز گزر گئے ہیں۔ تھانے میں مقتولہ کی ماں نے جو اُودھم بپا کیا

وہ بیان سے باہر ہے۔ حلیم اُس کی گالیاں خاموشی سے سُن رہا تھا۔
مقتولہ کے باپ نے مجھے کہا کہ میں رپورٹ لکھوں کہ اُس کی بیٹی کو حلیم نے قتل کیا یا کرایا ہے۔ وہ یہ ثبوت پیش کر رہا تھا کہ حلیم مقتولہ کو گھر سے نکلنے نہیں دیتا تھا، اس لئے یہ مانا نہیں جا سکتا کہ لڑکی خود باہر نکلی اور کوئی اسے اُٹھا کر لے گیا اور اسے آبادی سے دُور لے جا کر قتل کر دیا۔

حلیم نے اپنی صفائی میں شور شرابا بپا کر دیا۔ مجھے اب ۳۰۲ کی رپورٹ درج کر کے پرچہ کرنا ہی تھا۔ لاش اور پوسٹمارٹم رپورٹ میرے سامنے پڑی تھیں۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کر کے حلیم کو مشتبہ بٹھا لیا۔ اُس نے مجھے دو روز پہلے جو بیان دیا تھا اس میں ایسی وجوہات پائی جاتی تھیں جو قتل تک نوبت پہنچا سکتی تھیں۔ مثلاً مقتولہ کا حلیم سے یہ کہنا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔ اُس کا حلیم کی مردانگی پر طنز کرنا اور اُس کے ساتھ بُرا سلوک کرتے رہنا۔ حلیم کے ساتھ یہ دھوکہ بھی ہُوا تھا کہ اُس سے مکان لکھوا لیا گیا تھا مگر لڑکی اس کے ہاتھ سے نکل جا رہی تھی۔ یہ ایسی وجوہات ہیں جو بُزدل کو بھی دلیر بنا دیتی ہیں۔

لاش وارث لے گئے۔ میں نے حلیم کو تھانے میں رکھا۔ شہر میں خبر پھیل گئی کہ حلیم کی بیوی قتل ہو گئی ہے۔ بڑی سنسنی خیز واردات تھی۔ حلیم کا باپ اور اُس کے دو چھوٹے بھائی تھانے آ گئے۔ میں نے حلیم کو حوالات میں بند نہ کیا۔ اُسے کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے اُن کے

کمرے میں بٹھایا اور خود گھر چلا گیا۔
رات بارہ بجے کے بعد تھانے گیا اور حلیم کو اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ اُس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے دِق کا مریض ہو۔ خوف سے اُس سے کھڑا نہیں ہُوا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کے بچنے کی بہت گنجائش ہے بشرطیکہ وہ بتا دے کہ اُس نے اپنی بیوی کو کس طرح قتل کیا یا کرایا ہے۔ اُسے اپنے قبضے میں لینے کے لئے یہ بھی کہا کہ اُس کے خلاف اب کوئی ثبوت نہیں مل سکتا اور موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔

اُس نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ وہ قسمیں کھاتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیوی اس سے پہلے کبھی اُسے بتائے بغیر گھر سے نکلی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ دن کے وقت اکثر کام سے باہر رہتا تھا۔ کبھی پتہ نہیں چلا کہ وہ گھر سے کبھی نکلی ہے یا نہیں۔ اس طرح رات کو کبھی غائب نہیں ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ رات اُس نے کس وقت اُسے اپنے پلنگ پر دیکھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ تقریباً دو بجے وہ پیشاب کے لئے اُٹھا تو اُس کی بیوی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔

میں نے اس پر کم و بیش تین گھنٹے صَرف کئے مگر کچھ حاصل نہ ہُوا۔ میں اُس وقت اتنا تجربہ کار تو نہیں تھا پھر بھی مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ شخص ایسا خوفناک جُرم نہیں کر سکتا۔ پولیس کے سوال در سوال کے سلسلے اور جرح سے کوئی اُستاد ہی بچ سکتا ہے۔ اس آدمی میں مجھے کوئی چالاکی نظر نہ آئی۔ اس کے باوجود میں نے اسے بری قرار نہ دیا۔ یہ ممکن تھا کہ

اس نے رات غصے سے بے قابو ہو کر بیوی کا گلا گھونٹ دیا ہو اور لاش وہاں جا کر دفن کر آیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُس نے کسی دوست یا کسی اور کی مدد لی ہو۔ اس کے گھر کی تلاشی ضروری تھی۔

زیورات بھی غائب

صبح ہوئی تو میں اُس کے گھر کو چلا۔ اُس کا باپ رات بھر تھانے کے باہر بیٹھا رہا تھا۔ وہ میرے سامنے آگیا اور منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اُسے ساتھ لے لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا بیٹا بالکل بدھو ہے۔ اسے ہم نے منع کیا تھا کہ دوسری شادی نہ کرو۔ اگر کرنی ہی ہے تو اس گھر سے نہ کرو، کیونکہ لڑکی بھی مشکوک چال چلن کی ہے اور اس کی ماں بھی بہت چالاک اور عیار ہے۔ باپ نے کہا کہ اس کا بیٹا اتنا چالاک اور ہوشیار ہوتا کہ قتل تک کر سکتا تو مکان لڑکی کے نام نہ لکھ دیتا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ مقتولہ کسی اور کو چاہتی تھی؟

"آپ سے پہلے والا تھانیدار اسی مکان میں رہتا تھا جس میں آپ رہتے ہیں"—اُس نے جواب دیا—"اُس کا ایک بیٹا جوان تھا۔ اُس کے متعلق پتہ چلا تھا کہ اس لڑکی سے ملتا ملاتا تھا۔ بہر حال لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تھی۔ نوجوانی میں ہی اس نے دوستانے گانٹھنے شروع کر دیئے تھے۔"

یہ شخص چونکہ حلیم کا باپ تھا اس لئے میں اس کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو اپنے بیٹے کی حمایت کرنی تھی۔ تاہم میں نے اُس کی کئی ایک باتیں ذہن میں رکھ لیں۔ اُس سے بہت کچھ پوچھا اور اُس کے جواب یاد کر لئے۔

حلیم کے گھر جا کر تلاشی لی۔ کونے کھدرے بھی دیکھے۔ ٹرنک وغیرہ بھی کھول کر دیکھے۔ حلیم نے بیوی کی گمشدگی کے بعد اُس کا ٹرنک نہیں دیکھا تھا۔ یہ میں نے دیکھا۔ حلیم ساتھ تھا۔ ٹرنک میں بڑی خوبصورت ٹین کی صندوقچی رکھی تھی جو تقریباً ایک فٹ لمبی اور آٹھ نو انچ چوڑی تھی۔ ایسی صندوقچیوں میں زیورات رکھے جاتے تھے۔ میں نے صندوقچی کھولی تو خالی تھی۔

"وہ زیورات بھی لے گئی ہے"—حلیم نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا—"میں نے اس کے لئے بے شمار زیورات بنوائے تھے۔ سب لے گئی ہے۔"

میں نے حلیم کی بات فوراً نہ مان لی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اُس نے بیوی کو ٹھکانے لگا کر زیورات کہیں اِدھر اُدھر کر دیئے ہوں، لیکن میں نے یہ بھی ذہن میں رکھا تھا کہ لڑکی گھر سے بھاگی ہو گی اور زیورات ساتھ لے گئی۔ وہ جس کے ساتھ بھاگی اُسے زیورات نے بے ایمان بنا ڈالا اور وہ لڑکی کو قتل کر کے زیورات اپنے ساتھ لے گیا۔ اگر زیورات گئے تو نقدی بھی ہو گی۔ حلیم نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی

کو خوش رکھنے کے لئے اُسے پیسے بہت دیتا تھا۔

اس مکان سے کوئی سراغ نہ ملا۔ لڑکی کو قتل ہُوئے تین ہفتے گزر گئے تھے۔ ویسا سراغ تو مل ہی نہیں سکتا تھا جیسا میں ڈھونڈ رہا تھا۔ زیورات کی گمشدگی میرے لئے قابلِ غور تھی۔ مجھے حلیم کی ساس کا خیال آگیا۔ اُس کے متعلق جو رپورٹیں ملی تھیں ان کے پیشِ نظر میں نے اُس کے گھر کی تلاشی بھی ضروری سمجھی۔ حلیم کو ساتھ رکھا۔ اُس کے سُسر نے اپنے گھر کی تلاشی کے خلاف بہت احتجاج کیا۔ میری منت سماجت بھی کی مگر میں نہ ٹلا۔ مقتولہ کا جنازہ تھوڑی دیر پہلے ہو چکا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ مقتولہ کے باپ نے ایک بار پھر میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ میں تلاشی نہ لوں۔ یہ ان کی بے عزتی کا باعث تھا۔

بیٹی کی ماں تھانیدار کا بیٹا

"میں رُک جاتا ہوں" — میں نے اُسے کہا — "اپنی بیٹی کے زیورات اور رقم میرے حوالے کر دو۔"

اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ بیٹی کے زیورات کی ایک بھی چیز ان کے پاس نہیں۔ میں نے پہلی بار مقتولہ کی ماں کو دیکھا۔ بڑی خوبصورت عورت تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں کے بدلتے زاویے، اداسی میں بھی ہلکی سی مسکراہٹ، سٹائل اور چال ڈھال دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ میں نے

ایسی عورت پہلی بار نہیں دیکھی۔ مردوں کے سر کُھلوانے والی عورت ایسی ہی ہوتی ہے، اپنی بیٹی کا سودا کرنے والی عورت بھی ایسی ہی ہوتی ہے اور ایسی عورت آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر وہی تاثر آگیا جو میں پہلے سے جانتا تھا کہ آئے گا۔ میں نے اُسے الگ کر لیا۔

"اپنے خاندان کو ننگا نہ کرو" — میں نے کہا — "اپنی بیٹی کی جتنی نقدی اور جتنے زیورات ہیں وہ مجھے دکھا دو۔"

اُس نے بڑی اچھی اداکاری کی۔ اللہ، رسولؐ اور قرآن کی قسمیں کھائیں۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیمی سی آواز میں کہا — "اب اگر تم نے جھوٹی قسم کھائی تو میں تمہیں تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دوں گا۔ تم پر یہ لعنت جھوٹی قسموں کی وجہ سے پڑ رہی ہے۔ تمہاری بیٹی قتل ہوئی اور تمہارے گھر کی تلاشی ہو رہی ہے۔ توبہ کرو اور میرے ساتھ سچ بولو۔ بتا دو لڑکی کا اس گھر میں کیا کچھ رکھا ہے۔"

اُس نے پھر بھی مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کی۔ میں نے تلاشی شروع کر دی۔ زیورات کی تین چار چیزیں حلیم نے پہچان لیں۔ ان میں دو چیزیں حلیم کی پہلی بیوی چھوڑ گئی تھی جو دوسری بیوی نے اپنی ماں کو دے دی تھیں۔ کچھ رقم بھی برآمد ہوئی لیکن اس کے

متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ مقتولہ نے ماں کو دی ہے۔ حلیم کے مکان کی رجسٹری بھی برآمد ہوئی۔

حلیم کے سُسر نے مجھے اندر کے ایک کمرے میں روک لیا اور رو کر کہنے لگا کہ میری یہ بے عزتی اپنی بیوی اور بیٹی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اُس نے کہا کہ حلیم کے ساتھ اپنی بیٹی کا سودا اُس کی بیوی نے ہی کیا تھا۔

اس گھر سے اور کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے کچھ ایسا یقین ہونے لگا تھا کہ قاتل حلیم نہیں، اور یہ بھی کہ لڑکی کو غائب کرنے میں اس کی ماں کا ہاتھ نہیں۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ حلیم کی پہلی بیوی اور اُس کے بھائیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مخبروں نے جو رپورٹیں دیں، ان کے مطابق مقتولہ اور اُس کی ماں کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ حلیم کے باپ نے بتایا تھا کہ مجھ سے پہلے تھانیدار کے بیٹے کے ساتھ مقتولہ کا میل ملاپ تھا۔ ایک مخبر عورت نے اس کی تصدیق کی۔ یہ اطلاع میرے کام آسکتی تھی لیکن ابھی دیکھنا تھا کہ کیسے۔

میرے دماغ میں یہ آتی تھی کہ اگر میں حلیم کی یہ بات مان لوں کہ اُس کی بیوی بھاگ گئی ہے تو وہ تھانیدار کے بیٹے کے ساتھ بھاگی ہو گی۔ زیورات اور نقدی ساتھ لے گئی۔ باہر جا کر یُوں ہُوا ہو گا کہ تھانیدار کا بیٹا بے ایمان ہو گیا اور لڑکی کو قتل کر کے زیورات اور رقم لے اُڑا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں شہر سے پیدل نکلے اور راستے میں

پیشہ ور رہزنوں اور ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ مقتولہ کی لاش کے ساتھ زیور کی ایک بھی چیز نہیں تھی۔ یہ بھی رہزنوں نے اُتار لی ہوں گی۔

پہلی بیوی نے بھید کھولا

حلیم کی پہلی بیوی یا اُس کے بھائیوں پر انتقام کا شک کیا جا سکتا تھا۔ میں رات کو اُن کے گھر چلا گیا۔ اس گھرانے کے متعلق مجھے رپورٹ مل چکی تھی کہ شریف اور عزت دار گھرانہ ہے۔ وہاں دو جوان لڑکے تھے جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ شرمیلے اور سیدھے سادے ہیں۔ میں نے اُن کے گھر جا کر حلیم کی پہلی بیوی کے باپ سے بات کی۔ اُس کے آنسو نکل آتے۔ اُس کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ اُس نے حلیم کو بُرا بھلا نہ کہا بلکہ یہ کہا کہ بڑا سیدھا آدمی ہے۔ میں نے اس کے بیٹوں کو بھی بلا لیا۔ ان میں سے ایک کی عمر بیس سال کے قریب ہو گی اور دوسرے کی سولہ سترہ سال۔ دونوں شرمیلے سے تھے۔ اُن کے چہروں پر مجھے قتل کرنے والی دلیری کے آثار نظر نہ آتے۔

میں اُن کے ساتھ ایسے انداز سے باتیں کرتا رہا جس میں دوستی اور ہمدردی تھی لیکن میں اُن کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

بڑے لڑکے نے کہا — "اگر آپ اس شک پر یہاں آئے ہیں کہ

حلیم کی دوسری بیوی کے قتل میں ہمارا ہاتھ ہے تو مجھے اس سوال کا جواب دے دیں کہ ہم نے لڑکی کو کیوں قتل کیا؟ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری بہن کو اس لڑکی (مقتولہ) نے طلاق نہیں دلوائی۔ طلاق ہم نے خود مانگی تھی۔ حلیم تو طلاق دے ہی نہیں رہا تھا۔ اُس نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قصوروار حلیم ہے، اس کی دوسری بیوی نہیں۔ اُسے قتل کر کے ہم حلیم کے گھر اپنی بہن کو دوبارہ آباد نہیں کر سکتے تھے۔ آباد کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے خود طلاق مانگی تھی۔"

اس لڑکے کی بات میں وزن تھا۔ میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ یہ لڑکے قتل کی جرأت نہیں رکھتے۔ پھر بھی ان کے سینے میں جھانکنے کے لئے میں نے ان کے ساتھ گپ شپ کے انداز میں بہت دیر باتیں کیں۔ آخر انہیں کہا کہ میں ان کی بہن (حلیم کی پہلی بیوی) سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے معذرت کی۔ وہ شریف لوگ تھے۔ انہوں نے اندر جا کر اپنی بہن کو میرے پاس بھیج دیا۔ باپ بھی اندر چلا گیا۔

میں نے اس عورت کے ساتھ افسوس کا اظہار کیا کہ حلیم نے اسے طلاق دے دی ہے۔ ایسی ہی چند اور باتیں کر کے اس کے دل سے پولیس کا ڈر نکال دیا۔ اس کے ساتھ جو باتیں ہوئیں ان سے مجھے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ حلیم نے اس کا ڈاکٹری معائنہ کرایا تھا

اور وہ ٹھیک نکلی تھی۔ حلیم نے اپنا معائنہ ڈاکٹروں کے کہنے کے باوجود نہ کرایا۔ اکثر یُوں ہی ہوتا ہے کہ جس مرد کے اولاد نہ ہو وہ بیوی میں نقص بتاتا ہے اور اپنا معائنہ کرانے میں اپنی توہین سمجھتا ہے۔ حلیم کی پہلی بیوی نے بتایا کہ حلیم کا رویّہ بھی یہی تھا۔ بیوی کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے اپنا معائنہ نہ کرایا اور یہی کہتا رہا کہ وہ مکمل مرد ہے۔

اس عورت کے کہنے کے مطابق اس کے ساتھ حلیم کو بہت محبت تھی۔ حلیم دوسری شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اسے طلاق نہیں دے رہا تھا۔ بیوی برداشت نہ کر سکی کہ اس گھر میں کوئی اور عورت آئے۔ اس نے طلاق کی ضد کی۔ اُدھر مقتولہ کے والدین نے بھی طلاق کی شرط عائد کر دی۔ حلیم نے پہلی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اپنی محبت منتقل نہیں کرے گا، صرف اولاد کی خاطر شادی کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس عورت کو جائیداد کا حصّہ دے گا اور اسی کو اپنی اصل بیوی سمجھے گا مگر یہ عورت نہ مانی۔

میں نے اپنائیت کے انداز میں اپنے مطلب کی باتیں پُوچھنی شروع کر دیں۔ میں نے یہ دیکھا کہ یہ جوان سال عورت شریف ہے اور عقل والی بھی ہے۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں"— اُس نے باوقار سے لہجے میں کہا— "اگر آپ کو یہ شک ہے کہ میں نے حلیم کی دوسری بیوی کو اپنے بھائیوں سے یا کسی اور سے قتل کرایا ہے تو یہ وہم دل سے نکال

دیں۔ اگر میرے دماغ میں جُرم ہوتا تو میں ایک بڑا ہی آسان جُرم کرتی۔ میرے خاوند کو اولاد کی ضرورت تھی اور وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی سے اُسے اولاد دے سکتی تھی۔ اس اولاد کا باپ کوئی اور ہی ہوتا لیکن میرا خاوند اسے اپنی اولاد سمجھتا۔ میں طلاق سے بچ جاتی اور جائیداد کی وارث بنتی۔ اس لڑکی کو قتل کرنے سے کیا حاصل ہوتا؟ اُس کا تو اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے یہ حسد بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس بیوی سے حلیم کی اولاد پیدا ہوگی۔ حلیم دس شادیاں کرلے اُس کی اولاد نہیں ہوگی۔ مجھے عورتوں نے بتایا ہے کہ یہ لڑکی ماں باپ کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔ شاید ماں نے اسے یہ لالچ دیا تھا کہ حلیم کا مکان ہاتھ آجائے گا، زیورات اور رقم بھی مل جائے گی اور جو دل میں آئے کرنا۔"

"وہ کسی اور کو چاہتی تھی یا حلیم اسے پسند نہیں تھا؟"

"دونوں باتیں تھیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے حلیم سے کہا تھا کہ دوسری شادی کرنی ہی ہے تو اس لڑکی کے ساتھ نہ کرے۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ اس لڑکی کی دوستی کس کے ساتھ رہی ہے اور وہ بعد میں بھی یہاں آتا رہتا ہے۔ حلیم نے میری نہ سُنی۔ اُلٹا غصے میں بولا کہ تم حسد کی وجہ سے اُسے بدنام کر رہی ہو۔"

"کون ہے وہ؟"

"آپ سے پہلے تھانیدار کا بیٹا" — اُس نے جواب دیا — "ایسی

باتیں چھپی نہیں رہا کرتیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ان کی دوستی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اس لڑکی کے گھر کے ساتھ ایک گھر ہے۔ وہاں کی ایک لڑکی میری گہری سہیلی ہے۔ اُس کا ایک بھائی تھانیدار کے بیٹے کا دوست تھا۔ دونوں میں محبت اور رازداری تھی۔ تھانیدار کے بیٹے کا نام امین ہے۔ وہ کبھی کبھی رات کو اپنے دوست کے گھر آجاتا۔ وہ بیٹھک میں بیٹھتے تھے۔ کبھی لڑکی بیٹھک میں آجاتی، کبھی چھتوں کے اُوپر اُوپر سے اِدھر آجاتی اور امین اُوپر چلا جاتا۔ میری سہیلی بتاتی ہے کہ یہ لڑکی اُسے بڑے فخر سے اپنی محبت کے قصے سنایا کرتی تھی۔ میری اسی سہیلی کو اُس نے بتایا تھا کہ اُس کی شادی کہیں اور کی گئی تو وہ امین کے ساتھ بھاگ جائے گی۔"

رات کے آخری پہر کا راز

مجھ سے پہلا تھانیدار بھی مسلمان تھا۔ اُسے یہاں سے گئے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اُس کے اس بیٹے کو میں نے دیکھا تھا۔ ایف۔ اے پاس کر چکا تھا۔ اُس کا باپ اُسے اے۔ ایس۔ آئی بھرتی کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے چارج دے کر یہ تھانیدار وہاں سے چالیس میل دُور چلا گیا تھا۔

"امین کو یہاں سے گئے ایک سال ہونے کو آیا ہے" — میں نے حلیم کی پہلی بیوی سے کہا۔

"وہ یہاں تین چار بار آچکا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے اسی سہیلی نے بتایا ہے۔"

اس عورت نے مجھے بڑی قیمتی بات بتادی تھی۔ میں اُسے تسلی دلاسہ دے کر اور اُس کے باپ اور بھائیوں سے سلام دُعا کر کے رخصت ہُوا۔ میں نے حلیم کی پہلی بیوی سے اُس کی سہیلی کے بھائی کا نام پوچھ لیا تھا۔ میں نے دوسرے دن اُسے تھانے بلا لیا۔ اٹھارہ اُنیس سال کا یہ نوجوان بہت ڈرا ہُوا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس سے جو کچھ پوچھوں وہ بالکل سچ بتا دے اور کسی تھانیدار سے یا اُس کے بیٹے سے نہ ڈرے۔

اُس نے وہی بات تفصیل سے سُنا دی جو حلیم کی پہلی بیوی نے اختصار سے سنائی تھی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ امین اپنے باپ کے چلے جانے کے بعد بھی یہاں آتا رہا ہے اور لڑکی اُسے حلیم کے گھر سے آکر ملتی رہی ہے۔

"وہ آخری بار کب آیا تھا؟"

"بیس بائیس روز گزرے آیا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"حلیم کی دوسری بیوی کو ساتھ لے گیا تھا؟"

نوجوان نے یوں چونک کر میرے مُنہ پر نظریں جما دیں جیسے میں نے اُس کے دل میں خنجر اُتار دیا ہو۔ میں چُپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا سر ذرا سا ہلا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس کے ہونٹ ہلے۔

"لیکن اللہ کی قسم، اس میں میرا کوئی قصور نہیں" — اُس نے بڑی مشکل سے کہا — "وہ تھانیدار کا بیٹا ہے۔ بے شک وہ میرا دوست ہے لیکن وہ بہت دلیر اور بدمعاش بھی ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں۔"

میں نے اُسے حوصلہ دیا اور کہا کہ میں اُسے ملزم نہیں سمجھ رہا۔ بہرحال اُس نے بتایا کہ امین آیا اور اس کے گھر ٹھہرا تھا۔ اس نے ایک عورت کی زبانی حلیم کی دوسری بیوی کو پیغام بھیج دیا تھا۔ اُس نے اپنے اس دوست کو بتایا تھا کہ وہ لڑکی کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ رات کے آخری پہر وہ چلا گیا تھا۔ اس کا یہ دوست اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ اس سے چند روز بعد اُسے امین کا خط ملا۔ اس میں اُس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں لکھا تھا کہ اس کا کام ہو گیا ہے اور تم دوستی کی قدر کرنا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راز کو راز رکھنا۔

میں نے اُس سے خط مانگا تو اُس نے بتایا کہ وہ خط پھاڑ کر ضائع کر چکا ہے۔ البتہ اس نوجوان نے مجھے نہایت قیمتی بات بتائی۔ امین اس قدر آوارہ اور گمراہ ہو گیا تھا کہ کئی مہینوں سے اپنے باپ سے الگ ہو چکا تھا۔ باپ اُسے اے۔ ایس۔ آئی بنوانا چاہتا تھا لیکن لڑکا کسی اور طرف چل نکلا۔ اُس نے اب میرے تھانے سے کم و بیش نوّے میل دُور ایک شہر میں چھوٹا سا ایک ہوٹل کھول رکھا تھا۔

میں نے اس عورت کو پکڑا جس کے متعلق اس لڑکے نے بتایا تھا کہ اس کے ذریعے لڑکی کو پیغام بھیجا گیا تھا۔ یہ ایک غریب عورت تھی۔

اس نے صاف بتا دیا کہ امین کے پیغام وہی لڑکی تک لے جاتی تھی ۔ آخری پیغام یہ تھا کہ رات کے آخری پہر فلاں جگہ تیار ہو کر آجانا۔ یہ عورت پیغام دے آئی تھی۔ میں نے اس عورت سے اپنے مطلب کی تمام باتیں پوچھ لیں۔

مجھے بڑے کار آمد گواہ ملتے جا رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے قاتل پکڑ لیا ہے۔ امین اس جرم کے لئے نہایت موزوں آدمی تھا۔ دیہات میں جاگیرداروں اور اونچی ذات کے زمینداروں کے بیٹے اور شہر اور دیہات میں تھانیداروں کے بیٹے اپنے آپ کو فرعون سمجھتے ہیں۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے بالا ہیں۔ ہمارے ملک میں ہوتا یوں ہے کہ اس نسل کو قانون سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔ امین اسی نسل سے تھا۔ اس کے دوست نے بتایا کہ امین باپ سے الگ ہو گیا ہے اور کہیں اور کاروبار کر رہا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ سارے زیورات اور زیادہ سے زیادہ رقم ساتھ لے آئے۔ لڑکی زیورات اور رقم لے گئی۔ امین کو کاروبار کے لئے یا عیش و عشرت کے لئے یا جوئے میں لگانے کے لئے انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ اس نے لڑکی کا گلا گھونٹا اور اس کی لاش دفن کر کے زیورات اور نقدی لے گیا۔

صرف ایک سوال مجھے پریشان کر رہا تھا ۔۔۔ "اس نے لاش کو زمین میں دبانے کے لئے گڑھا کس طرح کھودا تھا؟ کدال کے بغیر اتنی

کھدائی ممکن نہیں تھی۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور آدمی تھا؟"

جس لڑکی کی لاش ملی وہ زندہ نکلی

میں نے اس جگہ خود ہی جانا بہتر سمجھا جہاں کے متعلق امین کے دوست نے بتایا تھا کہ وہ وہاں ہے۔ میں ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر رات کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں تھانے میں چلا گیا۔ وہاں ہندو تھانیدار تھا جس کے ساتھ اچھی جان پہچان تھی۔ وہ امین کے باپ کو بھی جانتا تھا۔ میں نے اس تھانیدار کا نام لے کر کہا کہ اس کا بیٹا جس کا نام امین ہے، وہ یہاں کہیں کوئی کاروبار کرتا ہے، میں اسے پکڑنے آیا ہوں۔

اس ہندو تھانیدار نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا ۔۔۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں وہ کہاں ہے۔ اسے پکڑ کر لے جاؤ لیکن یہ خیال رکھنا کہ وہ بری نہ ہو۔ اس نے یہاں ہوٹل کھول رکھا ہے۔ اس ہوٹل کے اندر کے کمرے میں جوا چلتا ہے اور چور اچکے اور غنڈے وہاں جمع رہتے ہیں۔ وہ میرے پاس آتا رہتا ہے اور اپنے باپ کا نام لے کر مجھے دوست بنائے رکھتا ہے۔"

"صاف کہو کہ ہوٹل کا چائے پانی تم تک پہنچتا رہتا ہے" ۔۔۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"چاتے پانی نہ پہنچے تو اس کا اڈہ ایک دن نہ چلنے دوں" — اُس نے کہا اور پوچھا — "اُس نے کیا کیا ہے؟"

"ایک لڑکی کے ساتھ محبت کی پھر اُسے گھر سے بمع زیورات اور رقم نکالا اور اُسے قتل کر کے مال مُتاع لے آیا۔"

"شہادت؟"

"بڑی پکّی" — میں نے جواب دیا — "لاش بگڑ گئی تھی لیکن وارثوں نے شناخت کر لی ہے اور شہادت کی ایسی کڑیاں ملی ہیں کہ اس کے اقبالی بیان کی ضرورت ہی نہیں۔"

ہندو تھانیدار نے ایک بغیر وردی کانسٹیبل کو امین کے ہوٹل میں یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ وہ وہاں ہے یا نہیں۔ کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ وہیں ہے۔ تھانیدار میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم ہوٹل میں گئے۔ امین ہمیں دیکھ کر دوڑا آیا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ایک سال پہلے اس کے باپ سے چارج لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیسے آیا ہوں۔

"تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں امین!" — میں نے جواب دیا — "فوراً میرے ساتھ چل پڑو۔"

"کہاں لے جانا چاہتے ہیں مجھے؟" — اُس نے میرا انداز بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں تم نے ایک جوان لڑکی کو قتل کر کے دفن کیا تھا۔"

"کون سی جوان لڑکی؟" — اُس نے حیرت سے پوچھا — "آپ کیا

کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟"

میں نے لڑکی کے باپ کا نام لے کر کہا — "اُس کی بیٹی جو حلیم کی دوسری بیوی تھی۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے؟" — اُس نے کہا — "وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔ بالغ لڑکی ہے۔"

"اور تم نے اپنی مرضی سے اُسے قتل کر دیا ہے" — میں نے کہا — "تم بھی تو بالغ ہو۔"

"آپ میرے گھر چلیں" — اُس نے کہا — "میں آپ کو حلیم کی دوسری بیوی دکھا دیتا ہوں۔"

میں حیران ہونے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں وہاں کے تھانیدار کے ساتھ اُس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہاں گئے تو وہ دوسرے کمرے میں جا کر ایک لڑکی کو ساتھ لے آیا۔ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ میں نے اُس سے نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام وہی بتایا جو حلیم کی دوسری بیوی کا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کا بھی نام بتایا۔ میں تو اسے پہچانتا نہیں تھا۔ وہاں کے تھانیدار نے میرے ساتھ مذاق شروع کر دیئے۔ میں چکرا رہا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ حلیم کی دوسری بیوی ہے۔

تھانیدار سے کہہ کر میں نے اس گھر کی باقاعدہ تلاشی کا انتظام کیا۔ کچھ زیورات برآمد ہوئے جو میں نے قبضے میں لے لئے۔ دونوں

کو میں ریلوے سٹیشن لے گیا۔ امین کو میں نے ہتھکڑی نہ لگائی۔ اُن دنوں ریل گاڑیوں میں آج کی طرح رش نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ خالی دیکھا تو ہیڈ کانسٹیبل، کانسٹیبل، امین اور لڑکی کو اس میں سوار کرا لیا۔ امین چونکہ تھانیدار کا بیٹا تھا اس لئے وہ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کے قتل کی بات کر رہا تھا۔ میں نے بات کو ٹالنے کے لئے کوئی اور بات شروع کر دی۔ امین اتنا پریشان نہیں تھا۔ لڑکی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ بات کرنے سے بھی ڈرتی تھی۔ اُس نے امین کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔

"کہتی ہے کہ اپنے خاوند کے پاس نہیں جاؤں گی" — امین نے مجھے کہا اور پوچھا — "ہمارے ساتھ آپ کیا سلوک کریں گے؟"

"تم ایک تجربہ کار تھانیدار کے بیٹے ہو" — میں نے اُسے کہا — "اپنا جُرم تم خود اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر تم دونوں میرے ساتھ اچھا سلوک کرو گے تو میں تمہارے ساتھ اس سے زیادہ اچھا سلوک کروں گا۔ دیکھ لو۔ میں نے تمہیں ہتھکڑی نہیں لگائی۔ یہ لڑکی بے شک بالغ ہے لیکن شادی شدہ ہے۔ اپنے خاوند کو دھوکہ دے کر بھاگی، زیورات اور رقم بھی چوری کر لائی ہے۔ تم نے اسے اغوا کیا اور چوری میں مدد دی ہے۔ مجھے تمہارے باپ کا خیال آتا ہے۔ تم مجھے ساری بات صاف صاف بتا دو تاکہ تمہیں بچانے کی کوئی ترکیب سوچوں۔"

میں نے اُسے لڑکی سے الگ کر لیا اور ذرا پرے جا بیٹھے۔ اس کے متعلق جو رپورٹ ملی تھی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے دوست نے اس کی اور حلیم کی دوسری بیوی کی محبت اور ملاقاتوں کی جو روئیداد سُنائی تھی وہ بھی دُرست نکلی۔ امین ہر بات سچ بتا رہا تھا۔ اگر اُس وقت امین وہاں ہوتا جب لڑکی کی شادی ہو رہی تھی تو وہ حلیم کے گھر جاتے ہی یا ماں باپ کے گھر سے امین کے ساتھ بھاگ جاتی۔ امین کو بہت دیر سے پتہ چلا۔ وہ یہاں آیا۔ لڑکی سے ملا اور لڑکی کا فرار طے ہوا۔ پھر وہ لڑکی کو لینے آیا۔ دوست کے گھر ٹھہرا۔ عورت کی معرفت انہوں نے ملنے کی جگہ طے کی۔ لڑکی نے زیورات اور رقم کی پوٹلی دن کو ہی باندھ کر ٹرنک سے باہر کہیں رکھ لی تھی۔

حلیم آدھی رات کے بعد پیشاب کے لئے جاگا۔ اُس وقت لڑکی جاگ رہی تھی۔ حلیم اُسے سوتی ہوئی سمجھتا رہا۔ وہ واپس آکر سو گیا تو لڑکی اُٹھی۔ پوٹلی اُٹھائی اور نکل گئی۔ امین بھی فوراً ہی آ گیا۔ دونوں ریلوے سٹیشن کے قریب اندھیرے میں چھپے رہے۔ گاڑی آئی تو وہ پلیٹ فارم کی طرف سے سوار ہونے کی بجائے دوسری طرف سے سوار ہوئے۔ انہوں نے ٹکٹ نہیں لئے تھے۔ وہ اس شہر میں اُترے اور کسی طرف سے سٹیشن سے نکل گئے۔ امین کو یہ معمولی سا ہوٹل کھولے تین چار مہینے ہو گئے تھے۔ اُس نے لڑکی کو نکاح کے بغیر داشتہ کے طور پہ رکھا ہوا تھا۔

لڑکی سے میں نے الگ بات کی۔ امین نے اسے کہا کہ چھپانے کی

ضرورت نہیں۔ ملک صاحب اپنے آدمی ہیں۔ ساری بات سنا دو۔ اُس نے وہی بیان دیا جو امین دے چکا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی ماں کو اُس کے فرار کا علم تھا؟ اُس نے بتایا کہ ماں کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ امین کو چاہتی اور اسے ملتی ملاتی ہے۔ ماں کے متعلق اُس نے یہ بتایا کہ وہ اسے کہتی رہتی تھی کہ حلیم سے زیادہ سے زیادہ پیسے لے کر گھر لاتی رہے۔ اس طرح اُس نے حلیم سے خاصی رقم بٹوری اور اپنی ماں کو دی۔

میں نے ان کے بیان سُنے اور پریشان ہوتا رہا کہ وہ لاش کس کی تھی جسے اس لڑکی کی ماں، باپ اور حلیم نے کہہ دیا تھا کہ اسی کی ہے۔ میں نے لڑکی کے سینڈل دیکھے۔ وہ اسی قسم کے تھے جیسے لاش کے پاؤں میں تھے۔ اس کے کپڑے کچھ اور قسم کے تھے۔

ہم اپنے تھانے میں پہنچے تو میں نے لاش کے ساتھ برآمد ہونے والا ایک چیتھڑا لڑکی کو دکھا کر پوچھا کہ اُس کے پاس اس قسم کا سُوٹ ہے؟ اُس نے بتایا کہ اس کا ایک سُوٹ بالکل اسی کپڑے اور اسی رنگ کے پھولوں کا ہے۔

پھر وہ لاش کس کی تھی؟

حلیم، لڑکی کی ماں اور اُس کے باپ کو تھانے بلایا۔ تینوں لڑکی کو دیکھ کر اس طرح حیران ہوئے جیسے ڈر بھی رہے ہوں۔ ماں اپنی بیٹی سے

لپٹ گئی۔ اُن کے پوچھنے کے باوجود میں نے انہیں نہ بتایا کہ لڑکی مجھے کہاں سے ملی ہے۔ میرے ذہن پر وہ لاش سوار ہوگئی جو برآمد ہوئی تھی اور اُسے اِن لوگوں نے اپنی بیٹی سمجھ کر پورے احترام اور تمام رسموں کے ساتھ دفن کیا تھا۔

اس موقع پر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ میں اِن احمقوں کی باتوں میں اور فرض کے ساتھ اپنی دیانتداری میں اُلجھ گیا تھا۔ میں نے لاش کی شناخت بھی غلط کرائی تھی۔ لاش کا چہرہ اتنا سُوجا ہُوا تھا کہ آنکھیں بند اور دبی ہُوئی تھیں۔

اُسی شام امین کا باپ آ گیا۔ وہ چالیس میل دُور کے ایک تھانے کا انچارج تھا۔ اُسے ہندو تھانیدار نے بذریعہ فون اطلاع دی تھی کہ اُس کا بیٹا پکڑا گیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا تھا۔ اُس نے بیٹے کو بہت گالیاں دیں، پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا اور ہم نے کیا وہ سُنانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی نہ حلیم کے ساتھ جانے پر رضامند تھی نہ ماں باپ کے ساتھ۔ امین کے باپ نے حلیم سے کہا کہ اُس نے اپنی بیوی کی کرتُوت دیکھ لی ہے۔ اب وہ اسے بیوی بنا کر نہیں رکھے گا، لہٰذا اسے طلاق دے دے۔

"مجھے مکان واپس دلا دو"۔ حلیم نے کہا ۔۔۔ "زیورات بھی دلا دو اور طلاق لے لو"۔

یہ مذاکرات امین کا باپ کر رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کے ماں باپ کو

راضی کر لیا کہ وہ مکان کی رجسٹری دے دیں۔ انہوں نے کاغذات دے دیے تھے۔ دوسرے دن تحصیل کے دفتر میں جا کر لڑکی نے مکان حلیم کے نام کرا دیا اور حلیم نے ایک یہ شرط بھی منوا کر طلاق دے دی کہ وہ حق مہر اور ماہوار خرچ نہیں دے گا۔

لڑکی نے تحریر دے دی کہ وہ حق مہر اور خرچ معاف کرتی ہے۔

لڑکی اماں کے ساتھ چلی گئی لیکن جو لاش برآمد ہوئی تھی اُس کے متعلق آج تک پتہ نہیں چلا کہ کس کی تھی۔ تحصیل کے تمام تھانوں سے پتہ کرایا۔ کسی بھی تھانے میں کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں آئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ پیشہ ور مجرم اُسے کہیں دُور سے اغوا کر کے لاتے تھے اور کسی وجہ سے اُسے قتل کر کے یہاں دفن کر گئے تھے۔

بہن کے سہاگ کے لیے

قتل کی یہ واردات بھی ایسی ہے جسے آپ عجیب و غریب کہیں گے۔ پولیس کی رائے کچھ اور ہوا کرتی ہے۔ در اصل قتل کوئی حیران کُن واردات نہیں ہوتی، عجیب اور دلچسپ اس کا باعث ہوتا ہے۔ قتل تو آپ بھی کر سکتے ہیں۔ ریوالور آپ کے ہاتھ میں ہو تو ٹریگر دباتے پورا ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا۔ انگلی کی اس ذرا سی حرکت کے لئے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو منٹ کے پاگل پن کی ضرورت ہوتی ہے۔

قتل کی یہ واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں مجھ پہ تھوپی گئی تھی۔ اس کی تفتیش کے ساتھ میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ دِلّی کے ایک تھانے کا کیس تھا۔ تھانیدار تفتیش کر رہا تھا۔ دو ہفتوں بعد مجھے حکم ملا کہ میں دِلّی کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں چلا جاؤں۔ وہاں سے ایک اور پولیس انسپکٹر میرے ساتھ ہو جائے گا اور ہم دونو ایک اینگلو انڈین لڑکی کے قتل کی تفتیش کریں گے۔ مجھے عارضی طور پر

اسپیشل سٹاف میں لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں بد قسمتی سے اپنے کام اور فرائض کو دیانتداری اور جانفشانی سے نبھانے کا عادی تھا، اور مجھ میں دوسری خرابی یہ تھی کہ میں انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا۔ دیانتداری کا مجھے انعام یہ ملا تھا کہ میں بڑی لمبی مدت ترقی سے محروم، انسپکٹر رہا اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوا۔ البتہ یہ انعام مجھے بے انداز ملا ہے کہ بڑے بڑے انگریز افسروں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے اور کہا:

WELL DONE MALIK!

ایک بات اور ہے۔ میں نے آپ کو اب تک ایسی کہانیاں سنائی ہیں جن کے ماحول، فضا اور کرداروں کو آپ اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں، مگر یہ واردات اور اس کی تفتیش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جسے وہی حضرات اچھی طرح سمجھ سکیں گے جنہوں نے جنگِ عظیم کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس کی زیادہ تر فضا فوجی ہے۔ میرے لئے یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور دلچسپ تجربہ تھا۔

میں آپ کو ان تفصیلات میں الجھا کر پریشان نہیں کروں گا کہ میں اس وقت کیا تھا اور کہاں تھا جب مجھے دلی پہنچنے کا حکم ملا تھا اور میرا انتخاب کس طرح کیا گیا تھا۔ اصل قصہ سناتا ہوں۔ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ یورپ پر جرمن فوجوں کا قبضہ تھا۔ ادھر جاپانی برما پر قابض ہو گئے تھے۔ خطرہ یہی آ رہا تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کریں گے۔ کلکتے کی بندرگاہ پر بمباری

ہو چکی تھی۔ انگریزوں کا ہندوستانی دارالحکومت دلی تھا۔ فوجی ہیڈکوارٹر (جی۔ ایچ۔ کیو) اور ایئر ہیڈکوارٹر بھی دلی میں تھے۔ ہر طرف فوجیوں کی چہل پہل تھی۔ فوجی افسر دندناتے پھرتے تھے۔

ان دنوں نئی دلی میں ایک اینگلو انڈین لڑکی قتل ہو گئی۔ متعلقہ تھانے نے تفتیش شروع کی۔ دو ہفتے گزر گئے۔ قاتل کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ہر تھانے میں قتل کی ایسی وارداتوں کی فائلیں التوا میں پڑی رہتی ہیں جن کا کھرا کھوج نہیں ملا۔ بعض کیس فائلوں میں ہی مر جاتے ہیں لیکن اس واردات کی تفتیش بھی ابتدائی مراحل میں تھی کہ انگریزوں کی حکومت نے واویلا بپا کر دیا۔ وائسرائے کے دفتر سے پولیس کو حکم ملا کہ اس قتل کی تفتیش تھانے سے ہٹا کر سپیشل سٹاف کو دی جائے اور جس قدر جلدی ہو سکے قاتل کا سراغ لگا کر اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔ میں دلی اپنے ہیڈکوارٹر میں پہنچا تو میرا تعارف ایک انگریز پولیس انسپکٹر میکڈانلڈ سے کرایا گیا۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرنا تھا۔ میں نے پہلا سوال یہ پوچھا کہ مقتولہ کی اہمیت کیا تھی۔ یہ سیاسی قتل تو نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتولہ کا باپ انڈین آرمی میڈیکل کور میں کرنل ہے اور وہ ڈاکٹر بھی ہے۔ ان دنوں وہ کلکتہ میں تھا۔ اس کے بیوی بچے اس کے ساتھ کلکتہ میں تھے۔ اس کی یہ بیٹی (مقتولہ) دلی میں فوج میں لیفٹیننٹ تھی۔

جنگ کے دوران عورتوں کی ایک فوج بنائی گئی تھی جو

کہلاتی تھی۔ عام زبان میں اسے وکی یا ویکائی کہتے W. A. C. I.
تھے۔ پورا نام تھا WOMEN AUXILIARY CORPSE OF INDIA
یہ عورتیں جن میں زیادہ تر جوان لڑکیاں تھیں فوجی دفتروں میں کام کرتی تھیں۔ ان میں اکثریت عیسائی لڑکیوں کی تھی۔ ہندو لڑکیاں بھی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زنانہ فوج کا درپردہ مقصد کچھ اور تھا۔ یعنی فوجی افسروں کا دل بہلانا۔ ان میں جو خوبصورت تھیں انہیں جرنیلوں تک رسائی اور بے تکلفی حاصل تھی۔ یہ کلبوں اور آفیسرز میسوں میں جاتی اور ڈانس اور شراب نوشی میں شریک ہوتی تھیں۔ ان میں جو اچھی شکل وصورت کی نہیں تھیں اور جن کا رنگ روپ رُوکھا پھیکا تھا وہ دفتروں میں کام کرتی تھیں اور فوجی ڈسپلن صرف انہی کے لئے تھا۔

مقتولہ اسی فوج کی لیفٹیننٹ تھی۔ جوان اور خوبصورت۔ وہ قتل ہوگئی تو اُس کے باپ کو کلکتہ میں اطلاع ملی۔ وہ دلّی آیا۔ تفتیش کا جائزہ لیا تو اُس نے دیکھا کہ یہ اس تھانیدار کے بس کی بات نہیں۔ وہ کرنل ڈاکٹر تھا اور اینگلو انڈین بھی تھا جنہیں ہم آدھے انگریز کہا کرتے تھے۔ اُس نے جی۔ ایچ۔ کیو میں جا ہنگامہ کیا۔ جرنیل بھی اُس کے زیرِ علاج رہ چکے تھے۔ اُس نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ ایجوٹنٹ جنرل نے وائسرائے کے دفتر کو لکھا کہ مقتولہ فوج کی لیفٹیننٹ اور ایک کرنل ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ اس کے قتل کا باعث عام قسم کی عشق بازی

اور رقابت بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ باعث ایسا ہو جو حکومت کے لئے اہم ہو، اس لئے اس واردات کی تفتیش تھانے کی بجائے پولیس ہیڈ کوارٹر کو دی جائے۔ چنانچہ یہ بندر کی بلا ہمارے سر ڈال دی گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ انگریزوں کے فوجی ہیڈ کوارٹر اور وائسرائے کے دفتر کو اس واردات کے ساتھ کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ یہ مقتولہ کے باپ کے غیر معمولی اثر ورسوخ کا نتیجہ تھا کہ اس واردات کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ اخباری لحاظ سے اسے اتنی سی بھی اہمیت نہ ملی کہ کسی اخبار میں اس کی خبر شائع ہوجاتی۔

میں اور انسپکٹر میکڈانلڈ متعلقہ تھانے میں گئے۔ ابتدائی معلومات وہیں سے مل سکتی تھیں۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اُسے ہم نے بتایا کہ ہم تفتیش کے لئے آتے ہیں تو وہ اتنا خوش ہُوا کہ اُس نے ہمارے لئے شراب اور تازہ پکوڑے منگوا لئے۔ میں تو شراب پیتا ہی نہیں تھا میکڈانلڈ نے بھی پینے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ ڈیوٹی پر تھا۔ ہندو تھانیدار نے اصرار کیا تو میکڈانلڈ نے بوتل اپنے ایک کانسٹیبل کو دے کر کہا — "میرے گھر دے آنا" — ہم نے پکوڑے کھاتے، چائے پی اور رپورٹ لینے لگے۔

گولی چلتی کار سے چلی

واقعات مختصراً یہ تھے کہ لڑکی ضرورت سے کچھ زیادہ خوبصورت

تھی۔ تھانے میں اُس کا فوٹو دیکھا۔ میکڈانلڈ زندہ دل انسان تھا۔ اُس نے فوٹو دیکھ کر مجھے کہا "میں اس لڑکی کی خاطر وائسرائے کو قتل کر سکتا ہوں .... آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے فوٹو کو غور سے دیکھ کر کہا "قاتل کا دماغی توازن ٹھیک نہیں، یا اس لڑکی نے اُسے عارضی طور پر پاگل کر دیا تھا۔ میں اس پر حیران ہوں کہ اس کے ساتھ ایک آدمی قتل نہیں ہُوا۔ شاید قاتل کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔"

"اسے میں ایک اچھا اتفاق کہوں گا کہ وہ آدمی بچ گیا ہے"۔ ہندو تھانیدار نے کہا "قتل چالیس میل فی گھنٹہ رفتار پر دوڑتی جیپ میں ہُوا ہے۔ ریوالور اسی رفتار پر دوڑتی کار سے فائر ہُوا تھا۔ لڑکی اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور جیپ ایک ہندوستانی میجر چلا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک کار آئی۔ اس میں سے ریوالور کی دو گولیاں فائر ہوئیں اور کار آگے نکل گئی"۔ ہندو تھانیدار نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا "دوسری گولی شاید میجر پر چلائی گئی تھی لیکن دونو گولیاں لڑکی کو لگیں۔"

اس تھانیدار نے ہمیں اس ہندوستانی میجر کا بیان سنایا۔

اس میں رائل ایئر فورس کے ایک افسر کا بھی ذکر تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی دیکھی اور تھانیدار کی کارگزاری بھی دیکھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس واردات کی تفتیش کسی تھانے کا تھانیدار نہیں کر سکتا۔ تھانیدار چور، اچکوں اور دوسرے جرائم پیشہ افراد کے خلاف

انتہائی پیچیدہ تفتیش بھی کر سکتے ہیں یا قتل اور ڈکیتی کی اُن وارداتوں کا سراغ لگا سکتے ہیں جو دیہاتی علاقے میں ہوتی ہیں۔ دیہات اور قصبوں میں اور جرائم پیشہ لوگوں کی زمین دوز دُنیا میں تھانیدار بادشاہ بلکہ فرعون ہوتا ہے۔ اس اینگلو انڈین لڑکی کے قتل کی تفتیش کے لئے فوجی حلقوں میں جانا اور انگریز افسروں سے ملنا تھا جو ہندوستانی تھانیدار کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے تھے۔ تھانیدار نے اس مشکل کا اظہار کر بھی دیا کہ اُس کے ساتھ کسی افسر نے تعاون نہیں کیا۔ رائل ایئر فورس کے افسر نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ جی۔ ایچ۔ کیو نے اس تھانیدار پر یہ کرم کیا تھا کہ اُسے ملٹری پولیس کے دو گورے دے دیئے تھے۔ ایک سارجنٹ اور دوسرا کارپورل (نائیک) تھا۔ انہوں نے بھی تھانیدار کو تعاون نہ دیا۔ زبان کی بھی دشواری تھی۔ تھانیدار انگریزی کسی حد تک سمجھ لیتا تھا بول نہیں سکتا تھا۔

قتل سے متعلق جو اشیاء تھانے میں رکھی گئی تھیں اُن میں ایک جیپ تھی۔ ریوالور کے دو سکے تھے جو مقتولہ کے جسم سے پار ہو کر جیپ میں گرے تھے۔ یہ سکے زیادہ پچکے نہیں تھے حالانکہ یہ جیپ کے اندر سٹیرنگ کے قریب سامنے لوہے کے ساتھ ٹکراتے تھے۔ مقتولہ کے جسم نے ان کی رفتار کم کر دی تھی۔ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق یہ ۳۸۔ بور کے تھے، یعنی ریوالور ۳۸۔ بور تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ریوالور کی دو گولیاں مقتولہ کے پہلو میں دائیں اور کچھ پیچھے سے

لگیں اور پار نکل گئیں۔ انہی سے موت واقع ہوئی۔ قتل سے پہلے مقتولہ کے ساتھ کوئی زیادتی یا تشدد نہیں ہوا۔ وہ شراب پیتے ہوئے تھی۔ اُس کے معدے میں کھانا بھی تھا جو دو اڑھائی گھنٹے پہلے اُس نے کھایا تھا۔

میں نے اور میکڈانلڈ نے اس ہندوستانی افسر سے بیان اور معلومات لے لیں لیکن اس کی پابندی نہیں کی۔ میں اپنا طریقہ کار استعمال کرنا چاہتا تھا اور میکڈانلڈ اپنا۔ ہم دونوں نے طے کر لیا تھا کہ پوچھ گچھ یعنی گواہوں اور مشتبہ افراد سے سوالات اپنے اپنے طریقے کے مطابق کریں گے اور ایک دوسرے کے پابند نہیں رہیں گے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا طریقہ کار بتا دیا اور یہ بھی کہ ہم دونوں کے ذہنوں میں کیا ہے۔ میکڈانلڈ کو سکاٹ لینڈ یارڈ کا تجربہ حاصل تھا۔ اس سے میں نے کچھ نئی باتیں اور نئے حربے سیکھے۔ اس لحاظ سے میری یہ تفتیش میرے لئے کارآمد ثابت ہوئی۔

ہم نے ملٹری پولیس کا تعاون حاصل کر لیا اور زور دے کر مطالبہ کیا کہ ہمیں خواہ ایک آدمی دیا جائے لیکن وہ ذہین ہو اور ہمارے ساتھ راتوں کو بھی جاگ سکے۔ پرووسٹ مارشل نے ہمیں ایک انگریز وارنٹ آفیسر دے دیا جو جفاکش بھی تھا اور عقل والا بھی۔ اس کے علاوہ ہمیں چھاؤنی میں ملٹری پولیس کے دفتر میں ایک الگ کمرہ دے دیا گیا جسے ہم نے اپنا دفتر بنا لیا۔ متعلقہ جیپ اپنے قبضے میں لے لی۔ سب سے پہلے ہم نے ہندوستانی میجر کو بلایا۔ موقعہ کا گواہ یہی ایک تھا۔ اس وقت

تک مقتولہ کو دفن ہوئے دو ہفتے گزر گئے تھے۔

سکواڈرن لیڈر اور میجر کا معرکہ

یہ میجر ہمارے سامنے آیا تو میں نے اُسے انگریز یا اینگلو انڈین سمجھا لیکن وہ ڈوگرا تھا۔ رنگ انگریزوں کی طرح، چہرہ نقش و نگار کے لحاظ سے دلکش اور قد بُت بہت اچھا۔ وہ ملٹری انٹیلی جنس کا افسر تھا۔ باقاعدہ تربیت یافتہ تھا اور ذہین بھی تھا۔ اُس وقت تک میرا واسطہ ہندوستان کے دیہاتی گواہوں اور ملزموں سے پڑا تھا۔ انٹیلی جنس (جاسوسی) کے تربیت یافتہ افسر سے تفتیش کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور موقعہ ملا تھا۔ وہ کہانی آپ کو سُنا چکا ہوں۔ اس میں مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس ڈوگرے میجر کے سلسلے میں مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میرے ساتھ ایک انگریز پولیس انسپکٹر تھا۔ اُس نے ڈوگرے سے کہا کہ وہ چونکہ خود انٹیلی جنس کا افسر ہے اس لئے وہ واردات کی تفصیل اُسی طرح سنائے جس طرح وہ جاسوسی کے کسی ملزم سے توقع رکھتا ہے۔

اُس نے مقتولہ کے متعلق بتایا کہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ مکمل طور پر آزاد تھی۔ وہ اینگلو انڈین تھی۔ ماں انگریز اور باپ ہندوستانی عیسائی تھا۔ رنگ رُوپ اور بول چال سے انگریز لگتی تھی۔ انگریز فوجی افسروں میں وہ بہت مقبول تھی۔ اُس کی راتیں کسی نہ کسی کلب یا آفیسرز میس

میں گزرتی تھیں۔ چھوٹے موٹے افسر کے ساتھ تو وہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اُس کی رسائی اور بے تکلفی بریگیڈیئر اور جرنیل کے عہدے تک تھی۔ بے حیائی کے ساتھ ساتھ وہ چالاک بھی تھی۔ یہ ڈوگرا میجر اُسے زیادہ اچھی طرح اس لئے جانتا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس میں ہونے کی وجہ سے وہ کلبوں اور آفیسرز میسوں میں جاتا رہتا تھا۔

قتل کی رات مقتولہ ایک کلب میں تھی۔ اُس رات کوئی دعوت تھی۔ فوجی افسروں کا ہجوم تھا۔ ان میں انگریز زیادہ تھے اور سول کے انگریز افسر بھی تھے۔ یہ ڈوگرا میجر بھی اس دعوت میں شریک ہوا۔ عورتیں بھی تھیں۔ خوب شراب چلی۔ ڈانس بھی ہوا۔ کلب کی عمارت کے بہت سے کمرے تھے۔ مرد اور عورتیں ان کمروں میں بھی جاتی تھیں۔ اخلاق، کردار اور شرم و حیا کا وہاں نام ونشان نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت ڈوگرا میجر باہر نکلا۔ برآمدے ویران پڑے تھے۔ رونق صرف اندر تھی۔ اُس نے مقتولہ کو دیکھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی آرہی تھی۔ ڈوگرا اُسے دیکھ کر رُک گیا۔ ایک کمرے سے رائل ایئر فورس کا ایک افسر نکلا۔ اُس نے ایئر فورس کی وردی پہن رکھی تھی۔ جنگ کی وجہ سے تمام فوجی ہر وقت وردی میں رہتے تھے۔ ڈوگرے میجر نے اس انگریز افسر کو وردی سے پہچانا کہ رائل ایئر فورس (برطانیہ کی فضائیہ) کا ہوا باز ہے۔ وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

لڑکی (مقتولہ) ڈوگرے میجر کے پاس رُک گئی۔ وہ غصے میں تھی۔ کہنے لگی کہ یہ افسر اُسے باتوں باتوں میں اُس کمرے میں لے گیا تھا۔ اس

سے پہلے اُس نے اس کے ساتھ ڈانس کیا تھا۔ کمرے میں لے جا کر ہوا باز افسر نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ پھر اُس نے لڑکی کو بازوؤں میں لے لیا اور اُسے صوفے پر گرا لیا۔ لڑکی نے بڑی مشکل سے اُس سے جان چھڑائی۔ یہ افسر زیادہ پی گیا تھا اس لئے لڑکی نے اُس پر قابو پا لیا تھا۔ لڑکی نے بھی شراب پی تھی لیکن اپنے آپ میں تھی۔

مقتولہ ڈوگرے کو تیزی سے سنا رہی تھی کہ ایئر فورس کا افسر آ گیا۔ لڑکی ڈوگرے کے پیچھے ہو گئی۔ ہوا باز قریب آکر رُک گیا۔ اُس نے جھومتی ہوئی آواز میں ڈوگرے سے کہا۔ "تم بھی انڈین ہو۔ اس لڑکی کو مجھ سے بچانے کی کوشش نہ کرو ورنہ میرے ہاتھ سے قتل ہو جاؤ گے۔ میں انڈیا کا بادشاہ ہوں۔"

ڈوگرا میجر ہنس پڑا اور بولا "تم اس وقت انڈیا کے نہیں ساری دنیا کے بادشاہ ہو۔ تم اس لڑکی کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ یہ فوج میں لیفٹیننٹ ہے۔"

"یہ اگر انڈین آرمی کی فیلڈ مارشل ہو تو بھی میری برابری نہیں کر سکتی"۔ ہوا باز افسر نے کہا۔ "ہم انڈیا کے آقا ہیں۔"

"میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں"۔ لڑکی نے ڈوگرے کی پیٹھ پیچھے کھڑے کہا۔ "تمہاری ایئر فورس کے گروپ کیپٹن اور ایئر کموڈور میرے دوست ہیں۔ تم تو سکواڈرن لیڈر ہو۔"

ڈوگرے میجر نے انگریز سکواڈرن لیڈر کے ساتھ دوستانہ انداز سے بات کی۔ اُسے یاد دلایا کہ کلب میں سول اور ملٹری کے اعلیٰ افسر بھی آتے ہوتے ہیں اس لئے ہمیں اچھے ڈسپلن کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ سکواڈرن لیڈر نے کہا۔"کیا تم لوگوں کو احساس نہیں کہ میں انڈیا کو جاپانیوں سے بچانے کے لئے انگلینڈ سے آیا ہوں؟ میں لڑاکا ہوا باز ہوں۔ انڈیا کے لئے مرنے آیا ہوں مگر انڈیا کی ایک لڑکی مجھے دھتکار رہی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا؟ میں اسے قتل کر دوں گا۔"

وہ آگے بڑھا۔ ڈوگرے نے اُسے روکا۔ سکواڈرن لیڈر نے ڈوگرے کے منہ پہ باکسروں کی طرح گھونسہ مارا جس سے وہ پیچھے کو گرنے لگا۔ پیچھے لڑکی تھی۔ اُس نے ڈوگرے کو سہارا دے دیا۔ ڈوگرے نے تیزی سے آگے بڑھ کر انگریز سکواڈرن لیڈر کے پیٹ میں ایک گھونسہ مارا۔ وہ آگے کو جھکا تو ڈوگرے نے اُس کے منہ پر گھونسہ مارا۔ سکواڈرن لیڈر پیچھے دیوار سے جا لگا اور آہستہ آہستہ اُٹھنے لگا۔ ڈوگرے کے کہنے کے مطابق اس انگریز میں لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ لڑکی نے ڈوگرے سے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کلب سے ہی نکل جاؤ۔ یہ انگریز ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ تم پر کوئی اوچھا وار کر جائے۔

"میں تمہیں بھی یہی مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ"۔ ڈوگرے میجر نے لڑکی سے کہا۔"تمہارا یہاں رُکنا مناسب نہیں۔ سب نشے میں بدمست ہیں۔ شاید تمہاری مدد کوئی بھی نہ کر سکے۔"

ڈوگرا میجر یہ بیان دیتے دیتے چُپ ہو گیا۔ اُس نے میرے ساتھی انگریز انسپکٹر میکڈانلڈ سے کہا۔"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ایک انگریز افسر کو مارا تھا اور اب میں انگریزوں کے خلاف باتیں کر رہا ہوں۔ میں آپ کا وفادار ملازم ہوں۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ میں ہر ایک بات بتاؤں۔ وہ صورتِ حال ایسی تھی کہ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کا بھی ردِّ عمل یہی ہوتا جو میرا تھا۔"

میکڈانلڈ ہنس پڑا۔ اُس نے ڈوگرے کو تسلی دی کہ اُسے اُس کی کوئی ایک بھی بات بُری نہیں لگ رہی۔ ڈوگرے کا ڈر بجا تھا۔ ہماری آج کی نسل جو پاکستان میں پیدا ہوتی ہے جانتی ہی نہیں کہ غلامی کی لعنت کیسی ہوتی ہے۔ انگریز کتوں سے محبت اور ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ کوئی ہندوستانی کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہوتا، معمولی سا انگریز اُسے دھتکار دیا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف تو انگریزوں کے دلوں میں اور زیادہ نفرت تھی .... میں دیکھ رہا تھا کہ بیان دیتے ہوئے ڈوگرے میجر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ بہرحال میکڈانلڈ نے کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کیا اور اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

مقتولہ ڈوگرے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس نے ڈوگرے کو بتایا کہ اُس کے پاس گاڑی نہیں اس لئے وہ فوراً نہیں جا سکتی۔ جب سب جائیں گے تو وہ کسی کے ساتھ چلی جائے گی۔ ڈوگرے میجر نے اُسے کہا کہ اُس کے پاس جیپ ہے اور وہ اُسے فوراً لے جا سکتا ہے۔ ڈوگرے

نے مسکرا کر اعتراف کیا کہ وہ لڑکی کو تفریحِ طبع کے لئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لڑکی چونکہ لیفٹیننٹ تھی اس لئے وہ افسروں (زنانہ) کے کوارٹروں میں رہتی تھی۔ وہ جگہ وہاں سے تقریباً چار میل دُور تھی۔ راستے میں کم و بیش ڈیڑھ میل علاقہ سنسان اور غیر آباد تھا۔ آگے پھر آبادی شروع ہو جاتی تھی۔

سکواڈرن لیڈر اُٹھ کر ڈوگرے کو للکار رہا تھا۔ ڈوگرے نے لڑکی کو ساتھ لیا اور جہاں اُس کی جیپ کھڑی تھی وہاں لے گیا۔ یہ فوجی جیپ تھی جو اُسے انٹیلی جنس ڈیوٹی کے لئے ملی ہوئی تھی۔ یہ جیپیں امریکہ سے آئی تھیں اس لئے ان کے سٹیرنگ بائیں طرف تھے۔ یعنی یہ گاڑی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ چھت کینوس کی تھی۔ اگلی سیٹ کے دائیں اور بائیں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ آپ نے اس قسم کی جیپیں دیکھی ہوں گی۔ ڈوگرے میجر نے لڑکی کو اگلی سیٹ پر بٹھایا اور گاڑی خود چلانے لگا۔ اُس کے ساتھ کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ لڑکی دائیں طرف بیٹھی تھی۔

موت کی جانب رواں ہوتے

جیپ چلی تو ڈوگرے نے لڑکی کے ساتھ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ لڑکی اُس کے ساتھ بے تکلف تھی اور اب اُس کی ممنون بھی تھی۔ اُس نے ڈوگرے میجر کو لطف اندوز ہونے کا موقعہ کشادہ دلی سے

دیا۔ اُس کا مُوڈ بہتر ہو گیا تھا۔ ڈوگرے نے اپنی گاڑی کے پیچھے کسی گاڑی کی روشنی دیکھی۔ جیپ ویران علاقے میں گئی تو پچھلی گاڑی اُس کی جیپ کے قریب آگئی اور فوراً ہی جیپ کے پہلو میں آگئی۔ میجر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں اور دو گولیاں چلیں۔ لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ اُس کے مُنہ سے نکلا HE HAS SHOT ME (اُس نے مجھے گولی ماردی ہے) گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور آگے نکل گئی۔ تب میجر نے دیکھا کہ وہ ایک پرائیویٹ کار تھی۔ اُس کی اگلی پچھلی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

ڈوگرے نے جیپ کی روشنی میں کار کا نمبر دیکھا مگر عین اُس وقت لڑکی آگے کو گری۔ اُس کا سر سکرین کے ساتھ لگا۔ میجر کی توجہ اُس کی طرف ہو گئی۔ اُس نے لڑکی کو دائیں بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا اور کہا کہ ذرا حوصلے میں رہو، میں کار کا تعاقب کرتا ہوں اور تمہیں ہسپتال پہنچا دیتا ہوں۔ ڈوگرے میجر نے کار کا جو نمبر دیکھا تھا وہ آدھا اُس کے ذہن سے نکل گیا کیونکہ اُس کی توجہ لڑکی کی طرف ہو گئی تھی۔ اُسے نمبر کے پہلے حروف اور پہلے دو ہندسے یاد نہ رہے۔ اُسے اتنا ہی یاد رہا کہ نمبر کے چار ہندسے تھے اور آخری دو ہندسے جو اُسے یاد رہ گئے تھے وہ تھے ۶۶۔ پہلے دو ہندسوں کے متعلق اُس نے بتایا کہ ۲۳ تھے یا ۳۲ یا ۸۳۔

ڈوگرا چونکہ فوجی تھا اس لئے وہ گھبرایا نہیں۔ کار دُور نکل گئی تھی۔

اُس نے جیپ کے ایکسیلیٹر پر پاؤں جو دبایا تو رفتار ستّر اور پھر اسّی تک پہنچا دی۔ کار کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ میجر کی کوشش یہ تھی کہ کار کو پکڑ نہ سکے تو کم از کم اُس کا نمبر نوٹ کر لے۔ اُس نے رفتار زیادہ کی اور کار سے بیس گز کے فاصلے پر پہنچ گیا مگر اتنے فاصلے سے نمبر صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میجر کے پاس ریوالور تھا جو وہ کپڑوں کے اندر چھپائے رکھتا تھا کیونکہ وہ انٹیلی جنس ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ اُس نے ریوالور نکالا مگر اُسے ایک بہت بڑی مشکل کا سامنا ہُوا۔ جیپ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ وہ بائیں طرف سے بازو باہر کر کے فائر کر سکتا تھا مگر یہ بازو دایاں تھا۔ اُس نے ریوالور بائیں ہاتھ میں لیا اور ذرا سا باہر ہو کر کار کے بائیں ٹائر پر تین گولیاں فائر کیں۔

میجر معلوم نہ کر سکا کہ گولیاں کہاں گئیں۔ اُسے زیادہ تر یقین یہ تھا کہ تینوں گولیاں خطا گئی ہیں۔ ایک تو ہاتھ بایاں تھا دوسرے نشانہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔ آگے موڑ آ گیا۔ کار مُڑی، اور جب جیپ مُڑی تو لڑکی دائیں کو ایسی لُڑھکی کہ اُس کا اُوپر کا دھڑ جیپ سے باہر چلا گیا۔ اگر میجر دیکھ نہ لیتا تو لڑکی باہر جا پڑتی۔ اُس نے رفتار کم کی اور لڑکی کو اپنی طرف گھسیٹا۔ اُس کا سر پیچھے کو گرا۔ لڑکی ہوش میں نہیں تھی۔ اُس وقت ڈوگرے میجر کو خیال آیا کہ لڑکی کو گولیاں معلوم نہیں کہاں لگی ہیں، اگر ہسپتال بروقت نہ پہنچایا تو یہ مر جائے گی۔ چنانچہ اُس نے جیپ موڑی اور ہسپتال کا رُخ کیا۔ فوجی ہسپتال میں گئے مگر ڈاکٹر

نے دیکھا تو لڑکی مر چکی تھی۔

ملٹری پولیس آئی۔ غالباً تفتیش سے بچنے کے لئے ملٹری پولیس نے کیس سول پولیس کو دے دیا اور چودہ دن گزر گئے۔ تھانیدار کو ڈوگرے میجر نے یہی بیان دیا تھا۔ رائل ایئر فورس کے سکواڈرن لیڈر سے تحقیقات ضروری تھی لیکن تھانیدار اُس تک کئی دن رسائی حاصل نہ کر سکا۔ صرف ایک بار ملا اور اُس نے تھانیدار کو ڈانٹ کر چلتا کیا۔ ملٹری پولیس نے کوئی مدد نہ کی۔

میں نے اور میکڈانلڈ نے ڈوگرے سے بے شمار سوال پوچھے۔ پہلا شک اسی انگریز سکواڈرن لیڈر پر تھا۔ ہم نے ڈوگرے سے پوچھا کہ سکواڈرن لیڈر کے پاس ریوالور تھا؟ ڈوگرے میجر نے ریوالور نہیں دیکھا تھا۔

"آپ جب لڑکی کو ساتھ لئے سکواڈرن لیڈر کے سامنے اپنی جیپ کی طرف چلے تھے تو اُس نے کیا کہا تھا؟"

"اُس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے" —— ڈوگرے نے جواب دیا —— "کہ میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ نے جب جیپ سٹارٹ کی اور وہاں سے چلائی تو آپ نے وہاں سے کوئی اور گاڑی نکلتے دیکھی تھی؟"

"میں نے دھیان نہیں دیا۔" ڈوگرے نے جواب دیا۔

"آپ جب اپنی جیپ کی طرف جا رہے تھے تو سکواڈرن لیڈر

آپ کے پیچھے آیا ہو گا؟"

"میں نے گھوم کر دیکھا تھا" — ڈوگرے میجر نے جواب دیا — "وہ برآمدے میں کھڑا گالیاں دے رہا تھا۔"

"وہاں اور کوئی نہیں تھا؟"

"بیرے اور ملازم تھے" — ڈوگرے نے کہا — "میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔"

"آپ اس لڑکی سے اچھی طرح واقف تھے؟" میں نے پوچھا — "اُس کا کوئی ایسا امیدوار تھا جس نے اُس کے ساتھ شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو؟"

"میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتا" — ڈوگرے نے جواب دیا — "میں یہ رائے بھی دینا چاہتا ہوں کہ اُس کے ساتھ شادی کا خواہش مند کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں۔ اُسے جو بھی چاہتا تھا وقتی طور پر چاہتا تھا۔"

"آپ انٹیلی جنس کے افسر ہیں" — میکڈانلڈ نے پوچھا — "آپ نے اپنے طور پر ضرور غور کیا ہو گا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔"

"مجھے اسی سکواڈرن لیڈر پر شک ہے" — ڈوگرے میجر نے کہا — "میرے ذہن میں یہ بھی آئی تھی کہ جنگ کی وجہ سے فوج میں ایسے ایسے نوجوانوں کو کمشن مل گئی ہے جو دولت مندوں اور سیٹھوں کے آوارہ بیٹے ہیں۔ بعض کو صرف اس لئے کمشن دی گئی ہے کہ اُن کے

باپوں نے وار فنڈ (جنگی فنڈ) میں بہت سارا چندہ دیا ہے۔ ان میں کچھ نوجوان سفلے اور کمینے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے کئی نوجوان ہوں گے جو شراب کے نشے میں شغل کے طور پر ریوالور فائر کر گئے۔"

"ذرا ذہن پر زور دے کر بتائیں" — میں نے کہا — "کوئی شادی شدہ ہندوستانی یا انگریز افسر ہو گا جس کے تعلقات مقتولہ کے ساتھ ہوں گے اور اُس کی بیوی نے لڑکی کو قتل کرا دیا ہو گا۔"

"ایسا ہو سکتا ہے" — ڈوگرے نے جواب دیا — "لیکن میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتا۔"

ہم نے اُس سے بہت کچھ پوچھا، پھر اُسے ملٹری پولیس کی جیپ میں متعلقہ کلب میں لے گئے۔ چند جگہیں دیکھیں جن میں وہ جگہ شامل تھی جہاں اُس کی اور سکواڈرن لیڈر کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ جگہ بھی دیکھی جہاں جیپ کھڑی تھی۔ سڑک دیکھی۔ جہاں گولی چلی وہ جگہ دیکھی۔ کار جس طرف گئی تھی وہ سڑک بھی دیکھی۔ اس کارگزاری میں رات آگئی اور ہم نے ڈوگرے میجر کو فارغ کر دیا۔

سکواڈرن لیڈر ذہنی مریض تھا

دوسری صبح ہم نے دو کام کئے۔ ایک یہ کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے کہا کہ شہر کی تمام کاروں کے نمبر دیکھے جائیں۔ جس کار کے نمبر کے آخری

ہندسے ۶۶ ہوں اُس کے مالک کا نام اور ایڈریس نوٹ کرلیں لیکن نوٹ ایسے انداز سے کریں کہ مالک کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ڈوگرے میجر نے بتایا تھا کہ کار فورڈ تھی۔ ماڈل کا سال مجھے یاد نہیں رہا۔ رنگ سیاہ تھا۔ ڈوگرے نے "سیاہ یا گہرا نیلا (نیوی بلیو)" بتایا تھا۔ اُس زمانے میں کاروں کی دو تین ہی قسمیں تھیں۔ آج کی طرح قسموں اور میکروں کی بھر مار نہیں تھی۔ ہم نے دوسرا کام یہ کیا کہ ایئر ہیڈ کوارٹر سے اس سکواڈرن لیڈر کا پتہ لیا۔ اُس کا نام پتہ تو تھانیدار سے معلوم ہو ہی گیا تھا، پھر بھی ہم نے ازسرِ نو معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ پالم ایئر پورٹ کے اُس حصے میں ملے گا جہاں انڈین ایئر فورس اور رائل ایئر فورس کے ہوائی جہاز رکھے جاتے ہیں۔

ہم ایئر ہیڈ کوارٹر چلے گئے کیونکہ ہمیں ٹیلیفون پر بتایا گیا تھا کہ اس سکواڈرن لیڈر کو ہندوستان میں آئے بمشکل ایک مہینہ ہوا ہے اور اُسے نہ کسی سکواڈرن کی کمانڈ دی گئی ہے نہ دی جائے گی اور اُسے کوئی اور ڈیوٹی بھی نہیں دی جا رہی۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ ٹیلیفون پر جو افسر بول رہا تھا اُس کی باتوں سے انسپکٹر میکڈانلڈ کو کچھ شک سا ہو گیا تھا۔ ہم ایئر ہیڈ کوارٹر گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میکڈانلڈ نے یہاں آکر کتنی بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ متعلقہ افسر نے بتایا کہ یہ سکواڈرن لیڈر زیرِ علاج ہے اور عارضہ ذہنی ہے، یعنی وہ نفسیاتی مریض تھا۔ اُسے ہندوستان

بھیجنا بھی علاج کا حصہ تھا۔ دلی میں ایک انگریز ماہرِ نفسیات کے زیرِ علاج تھا۔ نفسیات کا یہ ڈاکٹر کرنل تھا۔

یہ بڑا ہی کارآمد سراغ تھا۔ میں نے مقتولہ کا فوٹو تھانے میں دیکھ کر میکڈانلڈ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کے قاتل کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہو سکتا، یا لڑکی نے اُسے عارضی طور پر پاگل کر دیا ہوگا۔ میکڈانلڈ نے مجھے کہا تھا کہ مسٹر ملک! تمہاری رائے صحیح معلوم ہوتی ہے ..... ہم نے اس سکواڈرن لیڈر سے ملنے سے پہلے اُس ماہرِ نفسیات سے ملنا زیادہ ضروری سمجھا جو اُس کا علاج کر رہا تھا۔ ہم اُس کے پاس چلے گئے اور بتایا کہ ہم ایک اینگلو انڈین لڑکی کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں اور یہ لڑکی لیفٹیننٹ تھی۔ نفسیات کے اس ڈاکٹر نے اپنا کام دھندا چھوڑ دیا اور ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ میکڈانلڈ نے اُسے ڈوگرے میجر کا بیان سنایا اور اس سکواڈرن لیڈر کے متعلق پوچھا کہ اُس کا ذہنی عارضہ کس نوعیت کا ہے۔

نفسیات کے ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ سکواڈرن لیڈر انگلینڈ میں ایک لڑاکا سکواڈرن کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ جرمنی نے انگلینڈ کی تباہی کے لئے اپنا فضائی بیڑہ ایسا بے تحاشا استعمال کیا تھا کہ انگلینڈ کا کوئی نہ کوئی اہم شہر خصوصاً لندن، جرمنوں کی بمباری کی زد میں رہتا تھا۔ برطانیہ کا فضائی بیڑہ جرمنی پر بمباری کے لئے جاتا تھا۔ پاک بھارت جنگوں کی طرح دو دو یا تین تین ہوائی جہاز نہیں آتے تھے۔ ایک ایک بار کئی کئی سکواڈرن

آتے جاتے اور اُن کے ہوائی جہاز فضا میں لڑتے تھے۔ یہ فضائی جنگ جو دو سال سے زیادہ عرصہ لڑی گئی تھی BATTLE OF BRITIAN کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ فضائی معرکوں میں ہوائی جہاز مکھیوں کی طرح گرتے تھے۔ ہوابازوں کی اموات کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ برطانوی ہوابازوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ وہ حیران کر دینے والی بے جگری سے لڑتے تھے۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اس سکواڈرن لیڈر نے اتنے فضائی معرکے لڑے ہیں کہ ریکارڈ دیکھے بغیر یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس نے کتنے جرمن ہوائی جہاز گرائے ہیں اور اُس کے کتنے ساتھی ہواباز مارے گئے ہیں۔ آخری معرکے میں اُس کے ہوائی جہاز کے انجن میں گولیاں لگیں اور جہاز کو آگ لگ گئی۔ یہ ہوائی جہاز سے جلدی نکل نہ سکا۔ بلندی بہت کم تھی۔ اُس کی خوش قسمتی کہ نیچے سمندر تھا۔ ہوائی جہاز سمندر میں گرا لیکن ایسا گرا کہ فوراً ڈوبا نہیں۔ سکواڈرن لیڈر کو نکلنے کا موقعہ مل گیا۔ غالباً ہوائی جہاز جب سمندر سے ٹکرایا تو دھچکہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ اس سکواڈرن لیڈر کے دماغ پر اثر ہوا۔ وہ تیرنے لگا۔ ہوائی جہاز کا پٹرول سمندر پر بکھرا تو سکواڈرن لیڈر کے گرد شعلے اُٹھے جیسے سمندر کو آگ لگ گئی ہو۔ اُس نے ہمت کی اور شعلوں سے دُور چلا گیا۔ یہاں سے اُس کے اعصاب پر موت کی دہشت طاری ہونے لگی۔ اُس کے اُوپر ہوائی جہاز لڑ رہے تھے۔ وہ غوطے (ڈائیو) میں آکر مشین گنیں فائر کرتے تھے تو گولیاں

سکواڈرن لیڈر کے اردگرد گرتی تھیں۔ کوئی بھی گولی اُسے سمندر میں ختم کر سکتی تھی۔

بہت دیر معرکہ جاری رہا۔ یہ ختم ہُوا تو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ جرمنی کا کوئی بحری جہاز یا جنگی کشتی آگئی تو وہ پکڑا جائے گا۔ انگلینڈ کا ساحل دُور تھا۔ سکواڈرن لیڈر نے وہ جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے ساتھ لائف بوائے ہوتا ہے۔ اس سے انسان ڈوبتا نہیں، پھر بھی انسان اپنے آپ کو سمندر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے مارتے شل ہوگیا۔ سورج غروب ہوگیا۔ یہ ہواباز ساری رات سمندر میں رہا۔ صبح ہوئی تو برطانیہ کی ایک جنگی کشتی نے گشت کے دوران اسے اٹھا لیا مگر وہ صرف زندہ تھا۔ ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ اسے بچا لیا گیا۔ انگلینڈ کے کسی ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ وہ لندن کے مضافات کا رہنے والا تھا۔

دوسرا صدمہ

ہسپتال سے اُسے جلدی فارغ کر دیا گیا کیونکہ جسمانی لحاظ سے یہ ٹھیک ہوگیا تھا لیکن اس کا دماغ کبھی کبھی ذرا سی دیر کے لئے اس کے قابو سے نکل جاتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے یہ کہہ کر تسلّی دی تھی کہ یہ دھچکے کا اثر ہے جو جلدی ختم ہو جائے گا۔ اُسے دو دنوں کی چھٹی دی گئی۔

وہ اپنے گھر گیا تو وہاں کھنڈر دیکھے۔ اُس کا گھر بمباری سے تباہ ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی ماری گئی تھی اور اُس کا ایک ہی بچّہ تھا جس کی عمر دو تین سال تھی۔ وہ بھی مارا گیا تھا۔ اُس کے پڑوس کے کئی مکان تباہ ہو گئے تھے۔ سکواڈرن لیڈر کو یہ صدمہ لے بیٹھا۔ یہ دو دن کی چھٹی گزار کر اپنے سکواڈرن میں گیا۔ جنگ زوروں پر تھی۔ اسے فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھالنی پڑی۔ انگلینڈ میں صرف اس کی بیوی اور بچہ نہیں مرا تھا، وہاں تو گھر گھر ماتم ہو رہا تھا۔ لوگ چیونٹیوں کی طرح مر رہے تھے۔

اس سکواڈرن لیڈر نے ایسی حرکات شروع کر دیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اُس کے بالائی کمانڈر نے اُس سے باز پرس کی تو اُس نے بتایا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس دوران اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ایسے سکواڈرن لیڈر کو سکواڈرن کی کمانڈ نہیں دی جا سکتی تھی۔ وہاں ہر پرواز کا مطلب فضائی معرکہ تھا۔ اُسے نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے اُسے پرواز کے نااہل قرار دے دیا اور دوائیوں کے ذریعے اس کا علاج کرنے لگا لیکن اُس کی ذہنی حالت سُدھر نہ سکی۔ جس وقت بمباری ہوتی تھی اُس وقت اُس کی ذہنی حالت زیادہ بگڑ جاتی تھی۔ ایک ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ یہ جسمانی لحاظ سے ٹھیک ہے۔ اس پر بیوی اور بچّے کے صدمے کا اثر ہے۔ اس کا نفسیاتی علاج اُس جگہ ہو سکتا ہے جہاں بمباری نہ ہو اور جہاں کوئی دھماکہ نہ ہو۔ انگریزوں کی

بادشاہی میں ایسی جگہ ہندوستان ہی تھی۔ چنانچہ اسے ہندوستان بھیج دیا گیا اور اُسے صحت یاب ہونے تک دِلّی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اسے کوئی ڈیوٹی نہ دی گئی۔ اسے کھلی اجازت تھی کہ جہاں جی چاہے جائے اور عیش کرے۔ زیادہ تر وقت وہ نارمل رہتا تھا۔ کسی کسی وقت دس پندرہ منٹ کے لئے اُس کا مزاج بگڑ جاتا تھا۔

”کیا بگڑی ہوئی مزاجی کیفیت میں یہ قتل بھی کر سکتا ہے؟“

”اس کیفیت میں اُس کے متعلق کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔“ ماہرِ نفسیات نے جواب دیا — ”اگر اس کیفیت میں اسے غصّہ دلایا جائے تو اس کا ردِّ عمل قتل تک خطرناک ہو سکتا ہے۔ اگر اُسے اُداس کیا جائے تو یہ بچّوں کی طرح رو پڑے اور اگر اسے خوش کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ خوش بھی ہو سکتا ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ یہ اور زیادہ بگڑ جائے۔“

”عورت کے معاملے میں اس کا رویّہ کیا ہے؟“

”یہ تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل عورت بھی ارزاں ہے اور شراب بھی“ — ڈاکٹر نے کہا — ”فوجی افسر فرنٹ سے واپس آتے ہیں تو عیاشی کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں۔ موت اُن کے اعصاب پر سوار ہوتی ہے۔ لڑاکے پائلٹ کی تو زندگی ایسی ہے کہ کوئی بھی پرواز اس کی آخری پرواز ہو سکتی ہے۔ اس کا ردِّ عمل یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑاکا ہوا باز جسمانی عیاشی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ عادت اس سکواڈرن لیڈر میں بھی ہے۔

میں نے اس کے اس پہلو کی گہری چھان بین کی ہے۔ یہ عورت سے صرف جسمانی نہیں روحانی تسکین بھی چاہتا ہے مگر یہ عیاشی یعنی بدکاری اور روحانی مسرت کو الگ الگ نہیں کر سکتا۔ بہر حال یہ جذبہ اس پر غالب نہیں۔"

"آپ ایک بار پھر غور کریں" — میں نے ڈاکٹر سے کہا — "کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی کو کمرے میں لے گیا۔ لڑکی نے اس کا مطالبہ یا جسمانی یا روحانی ضرورت بے دردی سے ٹھکرا دی، اور اسی وقت اس پر وہ مزاجی کیفیت طاری ہو گئی جو آپ بتاتے ہیں کہ اس پر طاری ہوا کرتی ہے۔ غور کر کے بتائیں کہ وہ اس عارضی پاگل پن میں قتل کا ارتکاب کر سکتا ہے؟"

"اس کا مزاج فوراً بگڑ جاتا ہے" — ڈاکٹر نے جواب دیا — "اور اس کی کوشش کے بغیر، چند منٹ بعد، فوراً نارمل ہو جاتا ہے۔ ایسے نہیں ہوتا کہ مزاجی کیفیت آہستہ آہستہ نارمل ہو، اس لئے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ قتل کی رات اُس پر یہ کیفیت کتنی دیر طاری رہی۔"

"ہم اس سے مل رہے ہیں" — میکڈانلڈ نے کہا — "آپ سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس سے ایسے طریقے سے پوچھ گچھ کریں کہ وہ قتل کے متعلق کچھ بتا دے۔ وائسرائے کے ہاں اس قتل کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔"

"کیا آپ دونوں نے ایک اور پہلو پر بھی غور کیا ہے؟" — ڈاکٹر نے

پوچھا — "اگر میں یا آپ اس سے قتل کا اعتراف کرا لیں تو اسے سزا نہیں مل سکے گی کیونکہ میں اس کے متعلق یہ رپورٹ دوں گا کہ بگڑی ہوئی ذہنی کیفیت میں یہ اپنے کسی بھی فعل کا ذمہ دار نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ INSANITY (پاگل پن) میں ہر گناہ بخش دیا جاتا ہے۔"

"ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ قاتل کو سزا ملتی ہے یا نہیں" — میکڈانلڈ نے کہا — "ہمیں تفتیش مکمل کرنی ہے اور قاتل کو سامنے لانا ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ میں اس سے اقبالِ جُرم کرا لوں گا" — نفسیات کے ڈاکٹر نے کہا اور مسکرا کر بولا — "اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ میں اسے سزا سے بھی بچا لوں گا۔"

سکواڈرن لیڈر نشے میں تھا مگر ہوش میں

اُسی روز ہم نے سکواڈرن لیڈر کو ملٹری پولیس کے وارنٹ آفیسر کے ذریعے اپنے دفتر میں بلایا۔ وہ آگیا۔ اُس کی مزاجی کیفیت اچھی تھی۔ انسپکٹر میکڈانلڈ نے اُس کے ساتھ میرا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا کہ اُس نے میرے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا — "ہندوستانیوں میں یہ خرابی ہے کہ انگریزی نہیں جانتے۔ آپ سے پہلے جو تھانیدار آیا تھا اُس کے ساتھ میں نے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔"

"آپ نے اُسے ڈانٹ بھی دیا تھا"— میں نے ہنستے ہوئے
کہا —"اسی لئے یہ کیس ہمیں دیا گیا ہے۔"

"آپ کے اُس تھانیدار کی نسبت تو مجھے وہ انڈین میجر اچھا لگا تھا جس نے مجھے دو گھونسے مار کر گرا دیا تھا"— اُس نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا —"وہ انگریزی بولتا تھا اور وہ دلیر آدمی ہے۔"

کچھ دیر گپ شپ چلتی رہی۔ ہمارے درمیان جو اجنبیت تھی وہ ختم ہوگئی۔ میں چونکہ انگریزی بولتا اور سمجھتا تھا اس لئے آقا اور ملازم کا فرق بھی مٹ گیا۔ میکڈانلڈ نے اُس کی بیوی اور بچے کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ سکواڈرن لیڈر نے کہا —"انگلینڈ میں ہزاروں بیویاں اور ہزاروں بچے مارے جا چکے ہیں اور تباہی ابھی جاری ہے۔ اپنے ملک کے لئے ہمیں یہ قربانی دینی چاہئے لیکن میں نے کچھ زیادہ اثر لے لیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میں جلتے ہوئے ہوائی جہاز کے ساتھ سمندر میں گرا اور سولہ گھنٹے سمندر میں رہا تھا۔ دماغ پر اس کے اثرات پوری طرح موجود تھے جب میں نے اپنے گھر کے کھنڈر دیکھے اور یہ خبر میرے کانوں میں پڑی کہ میری بیوی اور بچہ مارے گئے ہیں۔ میرے اعصاب اتنے کمزور تو نہیں تھے لیکن دماغ نے ساتھ نہ دیا۔"

میکڈانلڈ خود انگریز تھا۔ سکواڈرن لیڈر کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس کا بھی گھر جرمنوں کی بمباری کی زد میں تھا۔ اُس

نے سکواڈرن لیڈر کے ساتھ کچھ جذباتی اور زیادہ تر حقیقی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں اُس نے سکواڈرن لیڈر سے پوچھا کہ اُس کا ذہن کس طرح بے قابو ہوتا ہے۔

"اگر آپ اسی طرح میرے ساتھ باتیں کرتے رہیں اور میری سنتے رہیں تو میرا ذہن کبھی بھی بے قابو نہ ہو"— سکواڈرن لیڈر نے جواب دیا۔ "مجھے جب باتیں کرنے اور سننے والا کوئی نہیں ملتا تو مجھے اپنے جسم کے اندر چیونٹیاں چلنے کا احساس ہوتا ہے۔ DEPRESSION ہوتی ہے، پھر مجھے کچھ خیال نہیں رہتا کہ اس دوران میں نے کیا کہا اور کیا کیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس لڑکی کے قتل سے پہلے آپ نے کیا کہا اور کیا کیا تھا"— میکڈانلڈ نے کہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے"— اُس نے جواب دیا —"میں اُس وقت وہسکی پیتے ہوتے تھا۔ نشے کی حالت میں میرے ذہن پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی جس کا علاج ہو رہا ہے"۔ وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا —"میں نشے میں تھا لیکن پوری طرح ہوش میں تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اتنی ساری لڑکیوں میں سے بہترین لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ اگر آپ نے مقتولہ کو دیکھا تھا تو آپ میرے انتخاب کی داد دیں گے۔ میں نے اُس کے ساتھ دو دفعہ ڈانس کیا۔ دوسری بار اُس نے بڑی ہی اشتعال انگیز مسکراہٹ سے مجھے کہا کہ میں کسی

اور لڑکی کے ساتھ ڈانس کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں فائیٹر پائلٹ ہوں۔ میں ہر فضائی معرکے میں دشمن کے ایک ہوائی جہاز کا انتخاب کر لیتا ہوں اور اُسے گرا کر دم لیتا ہوں اور اُسے پورا موقعہ دیتا ہوں کہ وہ مجھے گرا لے .... مجھے سب کچھ یاد ہے۔ آپ پوچھیں کیا پوچھتے ہیں، لیکن پہلے ہندوستانی تھانیدار کی طرح مجھے یہ نہ کہہ دینا کہ تم نے ایک لڑکی کو ریوالور کی گولیوں سے قتل کر دیا ہے۔"

"ہم بات تو یہی کہیں گے" — میں نے کہا — "لیکن ایسے طریقے سے کہیں گے کہ آپ کو غصہ نہیں آئے گا" — میں نے اُسے خوش کرنے کے لئے کہا — "میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ آپ نے اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔"

"مجھے غصہ نہیں آئے گا" — اُس نے کہا — "آپ لوگ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ میں تعاون کروں گا۔"

میکڈانلڈ کے کہنے پر اُس نے اپنے متعلق وہی کہانی سنائی جو نفسیات کا ڈاکٹر ہمیں سنا چکا تھا۔ اُس نے تین چار فضائی معرکے سنائے اور اپنے سکواڈرن کے ہوا بازوں کی بہادری کے واقعات بھی سنائے۔ یہ کارنامے اس قابل ہیں کہ آپ کو بھی سنائے جائیں، لیکن اصل کہانی رہ جائے گی۔ میں ان برطانوی ہوا بازوں کی تعریف کرتا ہوں جنہوں نے جان پر کھیل کر اپنے ملک کو جرمنی جیسی فضائی طاقت سے بچایا تھا۔ میکڈانلڈ پر جذباتیت کا ایسا غلبہ طاری ہوا کہ اُس

کے آنسو نکل آئے۔ سکواڈرن لیڈر ایسے انداز سے سنا رہا تھا جیسے اُس کے سامنے معرکے لڑے جا رہے ہوں اور وہ آنکھوں دیکھا حال سُنا رہا ہو۔

میں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، کیا یہ آدمی ایک اتنی خوبصورت لڑکی کا قاتل ہو سکتا ہے؟ میری سوچیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ کچھ اُس کے حق میں کچھ اُس کے خلاف۔ اُس کے خلاف یہ دلائل ذہن میں آتے تھے کہ یہ شخص موت کے ساتھ کھیلنے کا عادی ہے۔ اس نے ہوائی جہاز گرتے اور جلتے دیکھے ہیں۔ خود گراتے اور جلاتے ہیں۔ اپنے ملک کی تباہی اور لاشیں دیکھی ہیں۔ اس کے لئے یہ نہایت معمولی سا فعل ہے کہ کسی کو گولی مار دی جاتے۔ دوسری دلیل اُس کی ذہنی کیفیت کا اُتار چڑھاؤ تھا۔ تیسری دلیل یہ کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنا غلام سمجھتا تھا۔ چوتھی دلیل یہ کہ جب لڑکی نے اُسے دھتکارا اُس وقت وہ نشے میں تھا اور اُس پر حیوانیت کا بھوت سوار تھا اور اس مشتعل کیفیت میں ایک ہندوستانی میجر نے اُسے دو گھونسے مار کر گرا دیا تھا۔ میں ہندوستانیوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اپنے ملک کے قاتلوں کو میں چہروں سے پہچان لیا کرتا تھا۔ تفتیش کے دوران اُن کے چہروں پر جو رنگ آتے جاتے تھے اُن سے میرا کام آسان ہو جایا کرتا تھا مگر اس انگریز کے لب و لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی اور اُس کے چہرے کے تاثر میں ہلکی سی تبدیلی بھی نہیں آئی تھی — اُس

کا رنگ بدلتا ہی نہیں تھا۔

ریوالور "۳۸"

اُس نے جب سنایا کہ لڑکی کو وہ کس طرح اور کس مقصد کے لئے الگ کمرے میں لے گیا تھا تو اُس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کر کے اُسے انگلینڈ لے جائے گا۔ لڑکی ہنس پڑی تھی۔ سکواڈرن لیڈر نے جب دست درازی کی تو وہ اُسے دھکا دے کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ اُس نے اُسی طرح سنایا جس طرح ڈوگرا میجر سنا چکا تھا۔ اُس نے ہمیں یقین دلا دیا کہ اُس کا ذہن نارمل تھا۔

"کیا آپ مقتولہ کے ساتھ شادی کے خواہشمند تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "شادی کی پیش کش مذاق تھا۔"

"اُس وقت آپ کا خون کھول اُٹھا ہو گا جس وقت لڑکی نے آپ کو دھکا دیا تھا" — میں نے کہا۔

"مجھے غصہ ضرور آیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "لیکن میں بے قابو نہیں ہُوا۔"

"جس مرد کو ایک لڑکی اس طرح دھتکار دے کہ وہ اُس کے سامنے کسی دوسرے کے ساتھ چلی جائے تو اُس مرد کا پاگل ہو جانا

بعید از قیاس نہیں ہوتا" — میکڈانلڈ نے کہا۔

"وہ میری محبوبہ یا میری منگیتر نہیں تھی" — اُس نے کہا — "وہاں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ہال میں جاتے ہی مجھے ایک اور مل گئی تھی۔"

"اُس انڈین میجر کو آپ نے بخش دیا تھا جس نے آپ کو لڑکی کے سامنے دو گھونسے مارے تھے؟" — میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"ہاں!" — اُس نے کہا — "اگر میرے ذہن میں قتل جیسی بھیانک واردات آتی تو اُس کا شکار یہ انڈین میجر ہوتا اور میں اُسے جیپ تک نہ پہنچنے دیتا۔ میں آمنے سامنے لڑنے والا آدمی ہوں۔ یہ میرا ذاتی کردار ہے اور میرا پیشہ بھی یہی ہے۔"

"آپ کے کتنے دوست ہیں؟" — میں نے اس خیال سے پوچھا کہ اُس کے کسی دوست کے پاس کار ہو گی۔

"میرا کوئی دوست نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اس کلب میں دو بار آیا ہوں۔ ہندوستان میں آئے ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہُوا۔"

"آپ کے پاس ریوالور ہے؟" — میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"میرے پاس سروس کا کوئی ریوالور نہیں ہے" — اُس نے کہا۔ "وہ تو جب ہم پرواز کے لئے جاتے تھے تو ملا کرتا تھا۔ میرا ذاتی ریوالور ہے۔"

"آرمری میں رکھا ہو گا؟" — میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اپنے کمرے میں رکھا ہے۔"

"کون سا ہے؟"

"۳۸۔"—اُس نے جواب دیا۔

مقتولہ کو "۳۸۔" ریوالور کی گولیوں سے قتل کیا گیا تھا۔ سکواڈرن لیڈر کو احکام کے مطابق اپنا ذاتی ریوالور آرمری میں رکھنا چاہیے تھا۔ اس سے ہم شک میں پڑ گئے۔ وہ ذہنی مریض کی حیثیت سے آیا تھا۔ یہ متعلقہ افسروں اور ڈاکٹر کا کام تھا کہ یہ دیکھتے کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں۔ ہو سکتا ہے اِس نے کسی کو بتایا ہی نہ ہو کہ اُس کے پاس ریوالور ہے۔

"آپ نے یہاں آکر کسی کو بتایا تھا کہ آپ کے پاس ریوالور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہ میں نے بتایا نہ کسی نے پوچھا"—اُس نے جواب دیا—"انگلینڈ میں ریوالور میرے پاس رہتا تھا۔"

میکڈانلڈ نے سکاٹ لینڈ یارڈ کے انداز سے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ ایک خاص قسم کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ ایک ایک سوال کئی کئی بار ایسے طریقے سے پوچھا جاتا ہے جس سے ملزم یا مشتبہ کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ وہ اس سوال کا جواب متعدد بار دے چکا ہے۔ بعض سوال اُس کے جواب سے نکالے جاتے ہیں۔ ایک ہی گھنٹے میں مشتبہ کی زبان ہکلانے لگتی ہے، اور اُس کا ذہن اُس کے قابو سے نکل جاتا ہے۔ اس سکواڈرن لیڈر کا کیس چونکہ نفسیاتی نوعیت کا تھا اس لئے

میکڈانلڈ نے گپ شپ کا انداز اختیار کئے رکھا۔ فحش مذاق بھی کئے اور دوستانہ سی فضا پیدا کر کے اُس کے ارد گرد سوال در سوال کا جالا تنتا رہا۔ میں خاموش رہا اور اُس کے جوابوں کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔

اُسے دورہ پڑا

اس دوران ہم نے کھانا انگریزوں کے آفیسرز میس میں کھایا۔ سکواڈرن لیڈر نے میکڈانلڈ کو اپنے خرچ پر شراب پلائی۔ اس پر وہ بہت حیران ہوا کہ مسلمان شراب نہیں پیتے۔ اُس نے کہا—"آپ کو چار بیویاں شراب پینے کی مہلت ہی نہیں دیتی ہوں گی"—میں نے اُسے بتایا کہ چار شادیاں ہم پر فرض نہیں، نہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ ایک کی موجودگی میں دوسری بیوی لاؤں۔

وہ بڑے اچھے موڈ میں رہا۔ شام تک پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ہم اُس کے کمرے میں گئے۔ اُس نے اپنا ریوالور نکال دیا۔ اس کے ساتھ اٹھارہ گولیاں تھیں۔ کاغذات دیکھے۔ ان میں بھی اٹھارہ گولیاں لکھی تھیں۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ پندرہ سولہ روز پہلے اس ریوالور سے دو گولیاں فائر ہوئی تھیں یا نہیں۔ نالی صاف تھی اور اس میں ہلکا ہلکا تیل لگا ہوا تھا۔ یہ ریوالور پہلے تھانیدار کو فوراً قبضے میں لینا اور ایگزامینر کے پاس بھیجنا چاہیے تھا مگر اُس بے چارے کو کسی

نے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ ہم نے ریوالور قبضے میں لے لیا اور سرکاری طریقہ کار پورا کرنے کے لئے ایگزیمینر کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آپ نے اس ریوالور سے آخری گولی کب فائر کی تھی؟" ۔۔ میکڈانلڈ نے پوچھا اور کہا ۔۔ "اب میں آپ کو خبردار کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ذہن پہ ذرا زور دیں اور سوچ کر جواب دیں کیونکہ یہ بڑا خطرناک سوال ہے۔ ریوالور ایگزیمینر کے پاس جا رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ نالی اچھی طرح صاف نہیں کی گئی۔"

"مسٹر میکڈانلڈ!" اس نے میکڈانلڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔ "میں نے اس ریوالور سے کسی کو قتل نہیں کیا۔ اس ریوالور سے میں نے اڑھائی سال پہلے ایک خرگوش پر گولی چلائی تھی۔ جنگ کے دوران میرے ہوائی جہاز میں چار مشین گنیں تھیں۔ مجھے ریوالور فائر کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔" ۔۔ اس نے میری طرف منہ کیا اور کہا ۔۔ "مسٹر ملک! لکھ لو۔ اس ریوالور سے پہلی اور آخری گولی اڑھائی سال پہلے فائر ہوئی تھی۔"

انسپکٹر میکڈانلڈ چار سال سے ہندوستان میں تھا۔ اردو بڑی اچھی بول سکتا تھا۔ ہندوستانی پولیس اور فوج کے تقریباً تمام افسر اردو بول سکتے تھے۔ ان میں سے بعض علاقائی زبانیں بھی جانتے تھے۔ میں نے میکڈانلڈ سے اردو میں کہا ۔۔ "اسے اب ذرا گرما کر دیکھتے ہیں

کہ بگڑی ہوئی مزاجی کیفیت میں اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔"

"یہ کام آپ کر سکتے ہیں" ۔۔ میکڈانلڈ اردو میں بولا ۔۔ "مجھے یہ اپنا برطانوی بھائی سمجھتا ہے۔ میرا غصہ بھی برداشت کر لے گا۔"

"آپ پھر سوچ لیں" ۔۔ میں نے سکواڈرن لیڈر سے کہا ۔۔ "آپ اڑھائی سال کہنا چاہتے ہیں یا اڑھائی ہفتے؟"

"اڑھائی سال" ۔۔ اس نے زور دے کر کہا ۔۔ "سال .... سال .... ہفتے اور سال میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ایک انگریز اور ایک ہندوستانی میں ہوتا ہے۔"

اسے گرمی چڑھنی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اور زیادہ بھڑکانے کے لئے کہا ۔۔ "مگر اس وقت انگریز ایک ہندوستانی کے سامنے مشتبہ کی حیثیت سے بیٹھا ہے جو ملزم بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سال اور ہفتے میں اتنا فرق ہے جتنا زندگی اور موت میں .... پھر سوچ لیں جناب! میں آپ کے غصے کی پرواہ نہیں کروں گا، مجھے قانون کو خوش کرنا ہے" ۔۔ وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے کہا ۔۔ "میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ ریوالور اڑھائی ہفتے پہلے فائر ہوا ہے اور آپ جھوٹ بول رہے ہیں" ۔۔

وہ کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے بولنے نہ دیا اور کہا ۔۔ "انسپکٹر میکڈانلڈ نے آپ پر کرم کیا ہے کہ آپ کو خبردار کر کے کہا ہے کہ سوچ کر جواب دیں۔" اس کے چہرے پر میں نے پہلی بار تبدیلی دیکھی۔ اس کا رنگ

بدل گیا لیکن یہ تبدیلی گھبراہٹ اور خوف کی نہیں تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ وہ بیٹھ گیا۔ ہم اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اُس نے سر کو جھٹکا دیا اور میکڈانلڈ کی طرف دیکھا میکڈانلڈ نے ہمدردی کے لہجے میں پوچھا — "آپ شاید اپنے آپ میں نہیں رہے" — سکواڈرن لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ ہم نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ دو چار منٹ برآمدے کے ستون کے ساتھ سر لگائے کھڑا رہا، پھر لان میں چلا گیا جہاں پھولدار پودے تھے۔ اُس نے ایک پھول توڑا۔ اُسے دیکھتا رہا پھر گھاس پر لیٹ گیا۔

"اس سے زیادہ اور کتنا غصّہ دلایا جا سکتا ہے" — میکڈانلڈ نے کہا — "میرا خیال ہے کہ اس کا ردِّعمل قتل جتنا شدید نہیں ہو سکتا"

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا" — میں نے کہا — "ظاہری طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ غصّے کا ٹھنڈا ہے"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اندر آ گیا۔ میکڈانلڈ کو کمرے میں شراب کی بوتل نظر آ گئی تھی۔ گلاس بھی تھے۔ اُس نے دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈالی۔ ایک گلاس اُسے دیا، ایک اپنے پاس رکھا۔ سکواڈرن لیڈر نے گلاس خالی کر کے لمبا سانس لیا اور سر کرسی کی پیٹھ پر پھینک دیا۔

"آپ باہر کیوں چلے گئے تھے؟" میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"میں باہر چلا گیا تھا؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا اور کہنے لگا — "میرا خیال ہے میں پلنگ پر لیٹ گیا تھا"

اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ بہرحال ہم اُس کے متعلق کوئی ایسی رائے قائم نہ کر سکے کہ بگڑی ہوئی مزاجی کیفیت میں وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ وہ کلب سے کس وقت اور کس طرح اپنے کمرے میں آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایئر فورس کی ایک جیپ میں چھ سات افسر واپس آ رہے تھے، وہ ان کے ساتھ آیا تھا۔ ان میں سے وہ صرف ایک کو جانتا تھا۔ ہم نے ذہن میں نوٹ کر لیا اور اُس کا شکریہ ادا کر کے اُس سے اس طرح رخصت ہوتے جیسے اُس کے خلاف ہمیں کوئی شک نہیں رہا۔ اُس کا ریوالور ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ڈوگرا میجر مشتبہ تھا

وہاں سے ہم اُس افسر کے پاس گئے جس کے ساتھ سکواڈرن لیڈر جیپ میں آیا تھا۔ وہ بھی سکواڈرن لیڈر تھا اور ایئر ہیڈ کوارٹر میں کام کرتا تھا۔ اُس نے تصدیق کی کہ ہمارا سکواڈرن لیڈر آدھی رات کے بعد اُس کے ساتھ جیپ میں واپس آیا تھا۔ اس سے ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مشتبہ سکواڈرن لیڈر ڈیڑھ ایک گھنٹے

کے لیے کلب سے غائب تو نہیں ہوا تھا؟

"نہیں" — اُس نے یقین کے لہجے میں کہا — "میں نے اُس کے چہرے پر چوٹ کا نشان دیکھا تو پوچھا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک ہندوستانی میجر کے ساتھ لڑائی ہو گئی ہے۔ اُس نے وجہ بھی بتائی تھی۔"

"اُس وقت یہ غصے میں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے عجیب بات یہ دیکھی کہ وہ غصے میں نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا — "بلکہ کہتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اطمینان ہوا ہے کہ انڈین آرمی میں اتنے اچھے باکسر افسر ہیں۔ وہ خوش تھا۔"

"یہ گھونسے کھانے کے کتنی دیر بعد کی بات ہے کہ وہ آپ سے ملا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ اُس وقت گھونسے کھا کر آ رہا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس وقت نشان معمولی تھا جو ایک دو گھنٹوں بعد نیلا ہو گیا تھا۔"

"آپ نے اس کے پاس ریوالور دیکھا تھا؟"

"پتلون کی جیب میں ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا" — اُس نے کہا — "اُس کی کمر یا کندھے کے ساتھ ریوالور نہیں تھا۔"

اُس رات ہم نے یہ انتظام کیا کہ ملٹری پولیس کے ایک ہندوستانی حوالدار کو مخبر بنا کر کلب کے ملازموں میں شامل کر دیا۔ اُسے ڈیوٹی یہ دی کہ وہ ایسی کار پر نظر رکھے جس کے آخری ہندسے ۶۶ ہوں۔ اُسے

ہم نے سکواڈرن لیڈر بھی دکھا دیا اور اُسے بتایا کہ وہ دیکھے کہ اس کا کوئی ایسا فوجی یا شہری دوست ہے جس کے پاس کار ہو اور کار کے نمبر کے آخری ہندسے ۶۶ ہوں۔

میں اور میکڈانلڈ اکٹھے بیٹھے اور جو بیان لیے اور جو پوچھ گچھ کی تھی اس کا تجزیہ کرنے لگے۔ سکواڈرن لیڈر کے متعلق ابھی تک ہماری رائے دوہری تھی۔ اُسے ابھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ بعض باتیں اُس کے خلاف جاتی تھیں۔ آپس میں بحث کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ڈوگرے میجر کو ہم نے صرف گواہ کیوں بنا رکھا ہے۔ میں نے میکڈانلڈ سے کہا — "ڈوگرے میجر کے پاس بھی "۳۸. ریوالور تھا۔ وہ بھی لڑکی کا شیدائی تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اُس نے راستے میں لڑکی کو قتل کر دیا ہو؟ یہ تو اُس نے خود بتایا ہے کہ اُس کے پاس ریوالور تھا۔"

"میں نے اُسے ذہن سے اُتارا نہیں" — میکڈانلڈ نے کہا — "آپ مجھے یہ بتائیں کہ اُس کے پاس ریوالور کی موجودگی کے علاوہ اُس کے خلاف آپ کے پاس کیا ہے۔"

"اُس کے اپنے بیان کے مطابق مقتولہ چھوٹے موٹے افسر کے ساتھ مراسم نہیں رکھتی تھی" — میں نے کہا — "اس میجر کے ساتھ وہ گئی تو اُس نے میجر کو اپنے محافظ کی حیثیت سے قبول کیا۔ میجر کے بیان کے مطابق اُس نے راستے میں لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی کی۔ لڑکی نے مزاحمت نہ کی۔ وہ اُسے شاید خوش کرنا چاہتی تھی کیونکہ اُس نے لڑکی کو سکواڈرن

لیڈر سے بچایا تھا۔ اس ڈوگرے میجر نے لڑکی کے ساتھ غلط حد تک بے تکلف اور لُطف اندوز ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ ذرا غور کریں کہ جس لڑکی نے انگریز سکواڈرن لیڈر کو دھتکار دیا تھا اُس نے ہندوستانی میجر کی تو بے عزتی کر دی ہوگی۔ یہ بھی سوچیں کہ جس ہندوستانی میجر نے ایک انگریز افسر کو کلب میں گھونسے مار کر گرا دیا تھا وہ بہت ہی دلیر بلکہ وحشی ہوگا۔ میرے لئے یہ حیران کن نہیں کہ اُس نے لڑکی کو گولی مار دی ہوگی۔ چونکہ وہ انٹیلی جنس کا افسر ہے اس لئے اُس نے یہ کہانی گھڑ لی کہ دوڑتی کار سے اُسے کوئی گولی مار گیا ہے۔"

"آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ گولیاں لڑکی کے بائیں پہلو میں لگی ہیں؟" میکڈانلڈ نے کہا — "اور جیپ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میجر نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے لڑکی پر ریوالور فائر کیا ہے تو گولیاں بائیں پہلو میں لگنی چاہیئں تھیں۔ اس صورت میں گولیاں مقتولہ کے جسم سے گزر کر جیپ میں نہ رہتیں۔"

"آپ نے راستے میں ویران علاقہ دیکھا ہے" — میں نے کہا — "وہاں جیپ رکی تھی۔ میجر اُترا۔ دائیں طرف سے لڑکی کو اتارنے آیا۔ وہ نہ اُتری۔ اُس نے اُس کی بے عزتی کی۔ میجر نے اُسے دائیں طرف سے ایسے زاویے سے گولیاں ماریں کہ گولیاں اُس کے پہلو سے گزر کر جیپ میں لگیں۔ تعاقب کی کہانی جھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہسپتال اُس وقت گیا جب لڑکی مر چکی تھی۔ اس پر بھی غور کریں کہ میجر کے بیان کے مطابق

کار دائیں طرف سے قریب آئی۔ کار رائٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ سٹیرنگ پر بیٹھے بیٹھے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گولی فائر تو کی جا سکتی ہے، نشانے پر نہیں ماری جا سکتی۔ دونوں گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق دونوں گولیاں جہاں لگیں وہاں ان کے درمیان ایک انچ کے قریب کا فاصلہ تھا۔ دوڑتی گاڑیوں سے بائیں ہاتھ سے ایک ہی مقام پر دو گولیاں مارنا محض اتفاق ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کار کی اگلی سیٹ پر دو آدمی تھے۔ ریوالور بائیں والے آدمی نے فائر کیا ہوگا۔ اگر اُس نے دائیں ہاتھ سے فائر کیا ہے تو بھی مجھے شک ہے کہ اُس کا نشانہ اتنا اچھا ہو سکتا ہے۔ میں میجر کو صرف گواہ نہیں سمجھتا۔"

قاتل میجر تھا یا سکواڈرن لیڈر

ہم نے دوسرے دن جیپ کا ایک دفعہ پھر معائنہ کیا۔ وہ جگہ دیکھی جہاں گولیاں مقتولہ کے جسم سے نکل کر لگی تھیں۔ وہاں کے نشان بہت ہی غور سے دیکھے اور اندازہ لگایا کہ گولیاں کس زاویے سے آئی ہوں گی۔ ہم نے ڈوگرے میجر کو بلا بھیجا تھا۔ وہ آ گیا۔ اُسے ہم کمرے میں لے گئے۔

"آپ نے کار کے پچھلے شیشے میں سے یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ اگلی سیٹ پر ایک آدمی ہے یا دو ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"میں نے کوشش کی تھی" — اُس نے جواب دیا — "لیکن میری جیپ کی روشنی کار کے پچھلے شیشے پر پڑ رہی تھی اور شیشہ چمک رہا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔"

"یہ قدرتی بات ہے کہ آپ نے دائیں طرف فائرنگ کے دو دھماکے سُنے تو آپ نے فوراً دائیں طرف دیکھا ہوگا" — میں نے کہا اور اُس سے پوچھا — "آپ کو کار کی اگلی سیٹ پر کوئی آدمی نظر آیا ہوگا کسی کا بازو باہر نکلا ہُوا نظر آیا ہوگا۔ یاد کر کے بتائیں کہ وہ لوگ سویلین تھے یا فوجی؟"

"میں نے اتنی غور سے نہیں دیکھا" — اُس نے جواب دیا۔

"آپ انٹیلی جنس کے افسر ہیں" — میں نے کہا — "ہر بات پر غور کرنا اور ہر چیز کو غور سے دیکھنا آپ کی عادت ہونی چاہیئے ..... آپ کے ساتھی پر دو گولیاں چلیں۔ آپ کو اپنے ساتھی کی چیخ سنائی دی۔ کار آپ کے پہلو کے ساتھ تھی۔ دو گاڑیاں دوڑی جا رہی تھیں۔ کار کی رفتار زیادہ ہوئی۔ کچھ دُور تک دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو رہیں اور کار آگے نکل گئی۔ آپ کو کم از کم ایک منٹ مل گیا تھا کہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھ لیتے۔"

"میری توجہ لڑکی پر تھی" — اُس نے کہا — "اُس کی چیخ سے میں گھبرا گیا تھا۔"

"اگر آپ گنوار ہوتے، دیہاتی ہوتے، ان پڑھ ڈرائیور ہوتے تو

میں تسلیم کر لیتا کہ آپ نے کار کے اندر نہیں جھانکا" — میں نے کہا — "اور آپ نے کار کا جو نمبر دیکھا وہ فوراً ذہن سے اُتر گیا۔ پھر آپ کار کے تعاقب میں ایک بار پھر اُس کے قریب گئے مگر آپ کو کار کا نمبر نظر نہیں آیا۔ آگے موڑ سے کار بائیں کو گھومی تو اُس کا پورا پہلو آپ کے سامنے تھا۔ آپ نے اُس وقت اس پر فائر نہ کیا۔ آپ فوجی ہیں۔ اچھے اور بُرے ٹارگیٹ کو آپ سمجھتے ہیں۔ آپ کو ٹارگیٹ بڑا اعلا اور اچھا ملا تو آپ نے فائر نہ کیا۔ اگر آپ بائیں ہاتھ سے ہی باقی راؤنڈ بھی فائر کر دیتے تو ڈرائیور کو زخمی کر سکتے تھے۔"

اُس کا رنگ بدل گیا۔ گھبراہٹ بڑی صاف تھی۔ وہ بولا — "وہ صورتِ حال ایسی تھی کہ میں کسی اور طرف توجہ نہ دے سکا" — اُس کے لہجے میں اب رعب داب رہا ہی نہیں تھا۔ اُس نے دبی دبی آواز میں کہا — "میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کا رویّہ بھی ایسا ہی ہوتا۔"

"میں اپنے اور آپ کے رویّے کا مقابلہ نہیں کر رہا" — میں نے کہا — "اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک لیفٹننٹ قتل ہو گئی ہے اور وائسرائے کے پرسنل سٹاف کا حکم ہے کہ قاتل کو فوراً گرفتار کیا جائے۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ قاتل میری کوتاہی سے نکل گئے ہیں" — اُس نے کہا — "اگر مجھے تعاقب کے دوران پتہ چل جاتا کہ لڑکی مر چکی ہے تو میں تعاقب جاری رکھتا۔ میں لڑکی کو بچانا چاہتا تھا۔"

"سنو میجر!" — انسپکٹر میکڈانلڈ نے کہا — "آپ جانتے ہیں کہ ہم آپ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔ ہم آپ کو اس لڑکی کا قاتل سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیں یقین دلائیں کہ آپ قاتل نہیں۔"

"پھر آپ قتل کی تفتیش کر چکے۔" اُس نے بھڑک کر کہا — "میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ وقت ضائع نہ کریں۔"

مجھے میکڈانلڈ کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اُس نے آخری پتا سب سے پہلے پھینک دیا تھا۔ میں اُسے سوالوں جوابوں کے جال میں اُلجھا کر اُس کے منہ سے کہلوانا چاہتا تھا کہ وہ قاتل ہے۔ تاہم میکڈانلڈ کی دخل اندازی سے میں پریشان نہیں ہُوا۔ وہ کوئی اناڑی انسپکٹر نہیں تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر ہی یہ انداز اختیار کیا تھا۔

میجر انٹیلی جنس کا تھا

"میرے پاس قتل کی کوئی وجہ نہیں۔" ڈوگرے میجر نے کہا — "میں مقتولہ کے کسی چاہنے والے کا رقیب بھی نہیں۔ وہ خوبصورت ضرور تھی لیکن میں اُسے ایک اعلیٰ درجے کی طوائف سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اُس کے ساتھ میرے مراسم تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک میجر، ہندوستانی ہو یا برطانوی، اس لڑکی کے ساتھ دوستی نباہ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بہت مہنگی لڑکی تھی۔ اعلیٰ ترین

قسم کی شراب کی فرمائش کرتی تھی۔ کسی کے ساتھ صرف اُس ہوٹل میں جانا پسند کرتی تھی جہاں نوآب اور مہاراجے ٹھہرتے ہیں۔ اُس کی دوستی بریگیڈیئر سے نیچے کسی کے ساتھ تھی ہی نہیں۔"

"پھر آپ نے اس کے ساتھ یہ مراسم کس طرح نبھائے؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھے ان مراسم کے لئے فالتو الاؤنس ملتا تھا" — اُس نے کہا — "آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ہندوستانی میجر ہوں۔ ایک ہندوستانی میجر کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ اس کلب میں راتیں گزارے اور مقتولہ جیسی لڑکیوں کے ساتھ یارانے گانٹھے" — اُس نے آگے ہو کر رازداری کے لہجے میں کہا — "میں انٹیلی جنس کا افسر ہوں۔ اس کلب میں جب کبھی کوئی پارٹی ہوتی ہے جیسے قتل کی رات ہوئی تھی تو میں اس پارٹی میں ڈیوٹی کے طور پر شریک ہوتا ہوں۔ میں نے کلب کی انتظامیہ کو کچھ اور نام بتا رکھا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا ملک جاپانی اور جرمن جاسوسوں سے بھرا پڑا ہے۔"

"ہاں!" — میکڈانلڈ نے کہا — "میں جانتا ہوں۔ ہندوستانی پیسے کے لالچ میں جلدی آجاتے ہیں اور ہمارے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔"

"ایک پولیس انسپکٹر کی زبان سے مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔" — میجر نے کہا — "ابھی تین ماہ گزرے ہم نے ایک انگریز میجر کو پکڑا ہے۔ وہ جرمنوں کا جاسوس تھا۔ اُسے سزائے موت دی گئی ہے۔ یہاں

انگریزوں کے روپ میں جرمن پوشیدہ ہیں۔ برما پر جاپان قابض ہے۔ مغرب سے جرمنوں کا خطرہ ہے۔ جاسوسی بڑھتی جارہی ہے۔ کلبوں وغیرہ میں جاسوس اکثر آتے ہیں۔ یہاں فوج اور ایئر فورس کے بڑے بڑے افسر آتے ہیں۔ وہ محاذوں کے اکتائے ہوئے خوب شراب پیتے اور لڑکیوں کے ساتھ دوستی لگاتے ہیں۔ شراب اور عورت کے نشے میں وہ بے احتیاطی سے باتیں کرتے ہیں۔ عورتوں میں بھی جاسوس ہیں۔ وہ اِن سے راز اگلوا لیتی ہیں۔ ان عورتوں میں کرسچین بھی ہیں، اینگلو انڈین بھی، ہندو اور انگریز بھی اور انگریز عورتوں میں جرمن عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں نے مقتولہ کے ساتھ اپنی ڈیوٹی میں مدد حاصل کرنے کے لئے مراسم پیدا کئے تھے۔ میں نے ابھی اُسے بتایا نہیں تھا کہ میں انٹیلی جنس کا کام کر رہا ہوں۔ آپ میرے محکمے سے معلوم کرسکتے ہیں کہ مجھے اس قسم کی کوئی لڑکی پھانس کر اپنی ڈیوٹی کے لئے استعمال کرنے کا فالتو الاؤنس ملتا ہے ....

"میں نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ میری ڈیوٹی کیا ہے۔ وہ مجھے کسی مہاراجے کے خاندان کا آدمی سمجھتی رہی۔ ایک رات اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تم انٹیلی جنس کے میجر ہو؟ میں نے اُسے بتا دیا اور اُسے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اُسے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ قتل سے ایک ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ جونہی میں نے اُسے اپنے متعلق بتایا وہ میرے گلے لگ گئی اور مجھے الگ لے گئی۔ اُس نے اپنا تمام تر حُسن میرے سپرد کر دیا جس پر

میں حیران بھی ہُوا۔ اُس نے کہا ـــ 'میں اُن جاسوسوں کی دشمن ہوں جو انگریزوں کی بادشاہی کے خلاف کام کرتے ہیں۔ مجھے اپنی انٹیلی جنس کے ہر فرد سے محبت ہے' ـــ میں نے اُس کی محبت کو تو قبول نہیں کیا البتہ اُس کے ساتھ میری دوستی گہری ہو گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح میری مدد کر سکتی ہے۔ اُس نے کہا ـــ 'اس سے پہلے میں ان بڑے بڑے فوجی افسروں کو کسی اور رنگ میں دیکھتی رہی ہوں۔ اب آپ کے رنگ میں دیکھوں گی' ـــ میں خوش تھا کہ جاسوسوں کو پھانسنے کے لئے مجھے ایک دلکش جال مل گیا ہے۔"

"اُس نے کوئی جاسوس پکڑوایا تھا؟" میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ ڈوگرے میجر نے جواب دیا ـــ "اُس نے کوئی جاسوس نہیں پکڑوایا بلکہ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ خود جاسوس ہے۔ مجھے دیکھتی تھی تو ایسے والہانہ پیار کا اظہار کرتی تھی جیسے میرے بغیر ایک لمحہ نہ رہ سکتی ہو۔ مجھے اپنے ساتھ الگ تھلگ رکھتی تھی۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں اُس کی محبت میں گرفتار نہیں ہُوا بلکہ میں شک میں پڑتا گیا۔ وہ دوسروں سے اعلیٰ قسم کی شراب پینے والی کبھی کبھی مجھے شراب پلایا کرتی تھی۔"

انٹیلی جنس کا میجر اور جاسوس لڑکی

اس ڈوگرے نے تفصیل سے بتایا کہ یہ لڑکی اُس کے ساتھ کیسی کیسی

حرکتیں کرتی تھی ۔ ان سے اُسے شک ہُوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ڈوگرا اُسے بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے جاتا رہا اور اُس کا شک پختہ ہو گیا کہ لڑکی جاسوس ہے۔

"میں نے اُسے اسی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا"— میجر نے کہا۔ "دوستی اور زیادہ گہری کر لی اور اُسے موقعہ پر پکڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ قتل سے ایک ہفتہ پہلے تک میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ ہم دونوں دوستی کے پردے میں اپنا اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جاسوس کو محض شک میں نہیں پکڑا جاتا۔ اُسے عین موقعہ پر پکڑا جاتا ہے یا اُس کے خلاف جب قابلِ یقین شہادت مل جاتی ہے بہرحال ہمارا ایک اپنا طریقہ کار ہے۔ میں نے اپنے محکمے کے چیف کو بتا دیا تھا کہ میں ایک جاسوسہ کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں۔ میری یہ رپورٹ ریکارڈ میں ہے۔ آپ کو اجازت ملے تو میرے ہیڈ کوارٹر میں جا کر دیکھ لیں۔"

"آپ ہم پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ لڑکی کو سکواڈرن لیڈر سے چھڑا کر جب جیپ میں لے جا رہے تھے تو راستے میں آپ کے اور اُس کے درمیان کوئی بے مزگی پیدا نہیں ہوتی"— میکڈانلڈ نے پوچھا— "آپ نے دست درازی کی تو وہ مزاحم نہیں ہوتی۔"

"راستے میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہی تھی"— اُس نے کہا— "رات بہت گزر گئی تھی۔ میں واپس جانا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے

اُس کے کمرے میں چھوڑنے کے لئے جاتا تو کچھ دیر کے لئے اُس کے پاس رُک جاتا۔ اُس کی مزاحمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"کیا آپ کو اُس کے مرنے کا افسوس ہے؟"

"صرف اتنا کہ ایک جاسوسہ مر گئی ہے"— اُس نے جواب دیا— "اگر وہ زندہ رہتی اور میں اُسے موقعہ پر پکڑ لیتا تو میرا یہ کارنامہ میری آئندہ ترقی میں مددگار ہوتا۔"

اُس پر میکڈانلڈ نے اپنے طریقہ کار سے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو تین گھنٹے چلا۔ یہ ڈوگرا بے گناہ تھا یا بہت چالاک۔ اُس نے ہر سوال کا جواب خود اعتمادی سے دیا۔ اُسے رخصت کر دیا اور ہم اُن کمروں میں چلے گئے جہاں مقتولہ رہتی تھی۔ اُس کی ساتھی افسروں سے معلوم کیا کہ اُس کی گہری دوستی کس کے ساتھ تھی۔ دو جوان عورتیں بتائی گئیں۔ دونوں افسر تھیں۔ اُن سے مقتولہ کی ذاتی زندگی اور عادات کے متعلق پوچھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ بڑے بڑے افسروں میں مقبول تھی۔ غیر معمولی طور پر چالاک تھی۔ کسی کے ساتھ اُس کی محبت نہیں تھی۔ اپنی دوستوں کو باہر افسروں کے ساتھ گزاری ہوئی راتوں کے قصے سنایا کرتی تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اُس کا چال چلن اچھا نہیں تھا لیکن وہ اتنی سستی اور اوچھی نہیں تھی کہ ہر کسی کے ساتھ چل پڑتی۔ بعض افسروں کو تو وہ دھتکار دیا کرتی تھی۔ اُس کا دوستانہ بریگیڈیئر اور اس سے اوپر کے عہدوں کے افسروں کے ساتھ تھا۔

یہاں سے ہمیں کام کی کوئی بات نہیں ملی۔

میں نے اب تک مقتولہ کے باپ کا ذکر نہیں کیا جس کی کوششوں سے یہ تفتیش ہمارے گلے ڈالی گئی تھی۔ وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر کلکتے سے دِلی آگیا تھا۔ ہم جہاں ہوتے وہاں پہنچ جاتا۔ وہ کرنل تھا، ڈاکٹر تھا اور اینگلو انڈین تھا اس لئے اُس کا درجہ دوسرے ہندوستانی کرنلوں سے اُونچا تھا، یا وہ اپنے آپ کو خاص قسم کا کرنل اور بہت اعلیٰ قسم کا ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ ہمارے ساتھ بڑے رعب سے بات کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو وائسرائے سمجھنے لگتا تھا۔ ہم سکواڈرن لیڈر کا بیان لے چکے تو یہ کرنل آگیا۔ ہمارے کمرے میں بیٹھ گیا اور بولا ــ"لاؤ، مجھے دکھاؤ، تم نے اس سکواڈرن لیڈر سے کیا کچھ پوچھا ہے؟ .... تم اسے مجرم سمجھتے ہو؟" ــ ہم دونوں نے اُسے شریفانہ طریقے سے ٹالا۔ دوسری بار وہ اُس وقت ہمارے ساتھ آبیٹھا جب ہم اپنے مخبر سے رپورٹ لے رہے تھے۔

میکڈانلڈ کو غصہ آگیا۔ اُس نے اُسے کہا ــ"میں بالکل پرواہ نہیں کروں گا کہ آپ کرنل ہیں۔ فوراً اس کمرے سے نکل جائیں اور آئندہ ہمارے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہ کریں۔"

وہ چلا تو گیا، اگلے روز پھر آگیا۔ کہنے لگا ــ"میں ایجوٹنٹ جنرل کے پاس گیا تھا۔ اُس نے مجھے کہا ہے کہ میں تفتیش پر نظر رکھوں۔"

"میں تفتیش کو اسی مرحلے میں ختم کر کے وائسرائے کو رپورٹ لکھ

دوں گا کہ ہمارے کام میں دخل اندازی کی جا رہی ہے"ــ میکڈانلڈ اُس پر برس پڑا۔

کرنل گرفتار ہو گیا

وہ اگلے دو دن نظر نہ آیا۔ تیسرے دن ڈوگرا میجر ہانپتا کانپتا ہمارے پاس آیا۔ اُس وقت ہم اُس وقت تک کی تفتیش پر دونوں بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ اس کام میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کی جا سکتی تھی مگر میجر نے آداب اور ڈسپلن کی پرواہ نہ کی۔ کمرے کا دروازہ جاہلوں کی طرح دھکیل کر کھولا اور ہمارے درمیان جو میز پڑی تھی اُس پر زور سے ہاتھ مار کر انگریزی زبان میں بولا ــ"میرا شک صحیح نکلا۔ سو فی صد صحیح۔ وہ جاسوس تھی .... ابھی ثبوت نہیں ملا۔ اُس کا باپ گرفتار ہو گیا ہے۔"

ہم اپنا کام بھول کر اُس کی طرف متوجہ ہوتے۔ وہ تو ہیجان اور خوشی سے بے قابو ہُوا جا رہا تھا۔ ہم نے اُسے بیٹھنے اور اطمینان سے بات کرنے کو کہا۔ اُس نے بیٹھ کر جو بات سنائی وہ یہ تھی کہ گذشتہ رات کے آخری پہر دِلی کی ملٹری انٹیلی جنس کو کلکتے سے بذریعہ فون یا وائرلیس اطلاع ملی کہ اس اینگلو انڈین کرنل ڈاکٹر کو گرفتار کر کے ملٹری پولیس کی حراست میں دے دیا جائے۔ چنانچہ اُسے اُس ہوٹل کے کمرے

سے گرفتار کر لیا گیا جہاں وہ چھٹی گزار رہا تھا۔ صبح سے پہلے ڈوگرے میجر کو اور اس کے ایک اور ساتھی کو جگا کر حکم دیا گیا کہ فلاں ہوٹل کا فلاں نمبر کمرہ ملٹری پولیس نے سر بمہر (سیل) کر دیا ہے اور کرنل ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے، تم دونوں جا کر کمرے کی اور کرنل کے سامان کی تلاشی لو۔

ڈوگرا میجر دوسرے افسر کے ساتھ گیا اور کمرے کی تلاشی لی۔ کرنل کے اٹیچی کیس میں سے کچھ کاغذات برآمد ہوئے جنہوں نے جاسوسی کا جرم ثابت کر دیا۔ ان کاغذات کی تحریریں کوڈ (خفیہ الفاظ) میں تھیں۔ ایک آدھ اور ثبوت بھی مل گیا۔ کلکتہ سے فون پر یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ اس کرنل کا پورا کنبہ اس کے ساتھ کلکتہ میں تھا۔ کرنل کا چھوٹا بھائی جاسوسی کا جرم کرتے پکڑا گیا۔ اس پر تشدد کیا گیا تو اس نے بتا دیا کہ وہ خود بھی جرمنوں کا جاسوس ہے اور اس کا بھائی (کرنل ڈاکٹر) بھی جاسوس ہے۔ اب وہ جاپان کے لئے بھی جاسوسی کرتے تھے۔ اس تفصیل میں واضح اشارہ دیا گیا کہ کرنل کی جو بیٹی قتل ہوگئی ہے وہ بھی باپ کے گروہ میں شامل تھی۔

ڈوگرا میجر اس کیس میں مصروف ہو گیا تھا۔ کسی طرف جاتے ہمیں یہ خبر سنانے کے لئے رک گیا۔ وہ جلدی میں تھا۔ اٹھا اور بھاگ گیا اور ہمارے دماغوں کو کسی دوسری لائن پر چڑھا گیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے جاسوسی کے کیسوں اور ملٹری انٹیلی جنس کے کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں انسپکٹر میکڈانلڈ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ

ہنس پڑا۔ میں نے کہا — "ڈرامہ دلچسپ ہے"۔

"دو باتیں واضح ہوتی ہیں"۔ میکڈانلڈ نے کہا — "اس کرنل نے اپنی ڈاکٹری کی بدولت بڑے بڑے افسروں کو، ایجوٹنٹ جنرل تک کو، اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ اس نے وائسرائے کے پرسنل سٹاف تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس کی بیٹی نے اپنے حسن اور ایکٹنگ سے بڑے افسروں کو پھانس رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چھوٹے افسروں کو پلے نہیں باندھتی تھی۔ ڈوگرے میجر کو اس نے اپنے خوبصورت جال میں صرف اس لئے پھانس لیا تھا کہ وہ انٹیلی جنس کا افسر ہے۔ میں اس میجر کی ذہانت کی تعریف کرتا ہوں کہ اسے شک ہو گیا تھا کہ لڑکی جاسوس ہے مگر لڑکی زیادہ ذہین اور چالاک تھی جس نے میجر کی آنکھوں میں دھول جھونکے رکھی۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جرنیلوں سے دوستانے گانٹھنے والی ایک میجر پر کیوں فریفتہ تھی اور اس نے ایک سکواڈرن لیڈر کو کیوں دھتکارا تھا"۔

میکڈانلڈ نے ایک آدھ منٹ سوچ کر کہا — "اب مجھے قتل کا باعث بھی بدلا ہوا لگتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مقتولہ کو اس کے گروہ کے ہی کسی آدمی نے قتل کر دیا ہو۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ اچانک کسی کے متعلق انکشاف ہو کہ وہ جاسوس ہے اور اسے گرفتار کر لیا جاتے۔ مشتبہ جاسوس پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اس کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا رابطہ کس کس کے ساتھ ہے تاکہ تمام

کا تمام گروہ پکڑا جاتے۔ جاسوس اکیلا نہیں ہوتا، گروہ ہوتا ہے۔ کام تقسیم کئے ہوتے ہیں۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پورے گروہ کو پکڑا جائے۔
یہ صحیح طریقہ ہے جو اس میجر نے ہمیں بتایا تھا کہ مقتولہ پر اُسے شک تھا اور وہ اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا خیال ہے کہ کلکتہ میں کرنل کا بھائی مقتولہ کے قتل سے پہلے زیرِ نگرانی ہوگا اور اُس نے اپنے گروہ کو خبردار کر دیا ہوگا۔ گروہ نے محسوس کیا ہوگا کہ کرنل کی بیٹی بھی پکڑی جا سکتی ہے۔ وہ چونکہ عورت تھی اس لئے زیادہ تشدد برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گروہ نے خطرہ محسوس کیا ہوگا کہ لڑکی گروہ کے چند اور آدمیوں کو پکڑوا دے گی۔ اس کا انہوں نے یہ علاج سوچا کہ لڑکی کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ لڑکی کو نامعلوم افراد نے گولی مار دی۔ اگر میری اس رائے میں کچھ وزن ہے تو مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہمیں باقی تفتیش ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ مل کر کرنی پڑے گی۔"

"اس کے باوجود کہ آپ کی رائے میں مجھے بہت وزن دکھائی دے رہا ہے" ــ میں نے کہا ــ "ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں سکواڈرن لیڈر اور ڈوگرے میجر کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کروں گا۔"

دو کاریں ایک نمبر

اُس روز ہمیں ٹریفک پولیس سے دو کاروں کی اطلاع ملی جن

کے نمبروں کے آخری دو ہندسے ۶۶ تھے۔ ان کے مالکوں کے پتے نوٹ کر لئے گئے تھے۔ دونوں دلّی کے تھے۔ ڈوگرے میجر کو ساتھ لے جانا ضروری تھا کیونکہ اُس نے بیان دیا تھا کہ گولی کار میں سے چلی تھی اور اُس نے کار دیکھی اور اُس کا نمبر بھی دیکھا تھا۔ اب وہی کار کی شناخت کر سکتا تھا۔ ہم نے ڈوگرے میجر کو بلوا لیا اور اُسے کہا اگر اس واردات میں واقعی کسی کار کا عمل دخل ہے تو وہ چل کر شناخت کرے۔ وہ ہمارے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہم نے راستے میں اُس سے پوچھا کہ کرنل ڈاکٹر کے کیس میں کوئی اور گرفتاری ہوئی ہے یا نہیں۔ اُس نے مسکرا کر کہا کہ وہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ پورا کیس راز میں چلا گیا تھا۔ کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اس کے متعلق باہر جا کر کوئی بات کرے۔ بہرحال میجر نے کہا کہ اُسے ہمارے کام کا پوری طرح احساس ہے، اگر اُسے ہمارے مطلب کی کوئی بات معلوم ہوئی تو ہمیں بتا دے گا۔

ہم کار کے مالک کے پتے پر پہنچے۔ یہ ایک پرانی طرز کی کوٹھی تھی۔ کار باہر کھڑی تھی۔ مجھے آج اس کے نمبر کے پہلے حروف اور ہندسے یاد نہیں رہے۔ ۶۶ یاد رہ گیا ہے مگر ہندسے چار نہیں تھے۔ ڈوگرے میجر نے کہا ــ "اگر آپ یہ کار دیکھنے آتے ہیں تو اس کے مالک سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا رنگ ہی کچھ اور ہے اور اس کا نمبر تین ہندسوں کا ہے۔ اُس کار کے چار ہندسے تھے۔"

ہم وہیں سے واپس ہوئے اور دوسرے پتے پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک پارسی کا گھر تھا جو شراب کی درآمد کا کام کرتا تھا۔ اُس کے گھر

والوں نے بتایا کہ وہ دکان پر ہے۔ ہم تینوں وردی میں نہیں تھے ورنہ گھر والوں کی حالت غیر ہو جاتی۔ ہم اُس کی دکان پر گئے۔ یہ بہت بڑی دکان تھی بلکہ یہ ایک فرم تھی۔ اس کے باہر کار کھڑی تھی جس کے نمبر کے چار ہندسے تھے۔ آخری دو ۲۶ تھے۔ اس کا رنگ ایسا تھا کہ ڈوگرا میجر شک میں پڑ گیا۔ اُس نے نمبر کو بڑی ہی غور سے دیکھا اور ذہن پر زور دینے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہی کار ہو گی۔ اس کا مالک شراب کا امپورٹر تھا اور اس کی فرم بہت بڑی تھی۔ اس کا تعلق کلب کے ساتھ لازمی تھا۔ یہ شراب سپلائی کرتا ہو گا۔

ہم اندر گئے اور مالک سے ملے۔ وہ لاش کی مانند بوڑھا پارسی تھا۔ میکڈانلڈ نے اپنا تعارف کرایا تو وہ کچھ گھبرایا۔ اُس نے ہمیں اپنے دفتر میں بٹھایا۔ میکڈانلڈ نے اُس سے پوچھا کہ فلاں کلب کو وہ شراب سپلائی کرتا ہو گا۔ اُس نے بتایا کہ اس کلب کے علاوہ وہ تمام بڑی بڑی جگہوں کو شراب سپلائی کرتا ہے۔

"آپ کلب کی پارٹیوں وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں؟" میکڈانلڈ نے پوچھا۔

"مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی" — اُس نے کہا اور پوچھا — "کیا بات ہے؟ کوئی غیر قانونی شراب پکڑی گئی ہے؟"

"آپ گھبرائیں نہیں" — میں نے کہا — "واردات کہیں اور ہوتی ہے اور تفتیش کہیں اور کرنی پڑتی ہے..... آپ کے بیٹے ہیں؟"

"دو ہیں" — اُس نے جواب دیا — "ایک میرے ساتھ ہے، دوسرا بمبئی میں ہے۔ مال وہیں آتا ہے۔ ہمارا ایک دفتر اور گودام بمبئی میں ہے۔"

"باہر جو کار کھڑی ہے یہ آپ کی ہے؟" — میں نے کہا۔

"جی۔ میری ہے۔"

"یہ کار کلب میں جاتی ہو گی؟"

"بہت کم" — اُس نے جواب دیا — "مال لے جانے کے لئے دوسری گاڑی استعمال ہوتی ہے۔"

"آپ کا بیٹا تو کلب میں جاتا ہو گا!"

"بل کی وصولی کے لئے وہی جایا کرتا ہے۔"

"رات کو بھی جاتا ہو گا؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں نے اُسے رات کو کبھی نہیں جانے دیا کیونکہ رات کو کلب یا کسی بڑے ہوٹل میں جانے کا مطلب عیاشی ہوتا ہے۔ میں اپنے بیٹوں کو اس راستے پر نہیں ڈالنا چاہتا۔"

اُس کے بیٹے کو بلایا اور باپ کو باہر بھیج دیا۔ وہ خوبرو جوان تھا۔ رنگ پارسیوں کی طرح سفید۔ ظاہری طور پر چست اور چالاک لگتا تھا۔ میں نے اور میکڈانلڈ نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس نے جب سُنا کہ ہم دونوں پولیس انسپکٹر ہیں تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی کانپ رہا ہے۔ ڈوگرا میجر بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن اُسے ہم نے باہر بٹھا دیا تھا کیونکہ تفتیش اُس سے خفیہ رکھنی تھی۔ ہم اُسی

کے بیان کی روشنی میں کاریں دیکھتے پھر رہے تھے۔ ہمیں ڈوگرے پر شک تھا۔ میں ابھی تک یہ سوچ رہا تھا کہ قتل میں کار استعمال ہوئی ہے یا نہیں۔ تفتیش شکوک کی بنا پر ہی کی جاتی ہے۔ اگر ہر مشتبہ کی اور ہر گواہ کی بات کو سچ مانتے چلے جاؤ تو واردات کا سراغ کبھی نہیں ملتا۔

میجر کار کو دیکھتا رہا

مجھے خیال آگیا کہ ڈوگرا میجر کلب میں جاتا رہتا تھا اور وہ ہر کسی کو غور سے دیکھتا تھا کیونکہ انٹیلی جنس ڈیوٹی کے لیے جاتا تھا۔ میں باہر نکلا۔ ڈوگرا ہماری جیپ میں بیٹھا تھا لیکن جیپ وہاں نہیں تھی جہاں ہم نے کھڑی کی تھی۔ ڈوگرا اسے سڑک پر لے گیا اور کار کے پیچھے کھڑی کر دی تھی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اُس نے جیپ ریورس کی اور کار سے دُور لے گیا۔ وہاں سے آہستہ آہستہ آگے لایا اور کار کے پیچھے روک لی۔ میں اُس کے قریب جا کر کھڑا ہوا۔ وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ اُس نے میری طرف دیکھا تو ایسے لگا جیسے اُس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ پھر پارسی کی کار کو دیکھنے لگا۔ اُس نے جیپ کو پھر پیچھے کیا اور آگے لا کر کار کے دائیں طرف کھڑی کر دی۔ میں پھر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

انجن بند کر کے وہ اُترا اور گہری سنجیدگی کے لہجے میں کہنے لگا — "میں بہت دیر سے کار کو پیچھے سے دیکھ رہا ہوں۔ میں وثوق سے کہہ

نہیں سکتا کہ یہی کار تھی۔ ماڈل اور میک وہی ہے۔ رنگ نے مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اُسے اُس کار کے سوا دُنیا کے کسی اور انسان یا چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اُسے کچھ اور کہہ رہا تھا مگر وہ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ میں کسی اور مقصد کے لئے باہر نکلا تھا اور مجھے جلدی اندر جانا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "پہلے میری بات سُن لو پھر اسے دیکھتے رہنا۔"

"انسپکٹر ملک!" — اُس نے گہرے سنجیدہ لہجے میں اُردو زبان میں مجھے کہا — "آپ نے مجھ پر قتل کا شک کیا ہے۔ ایک بدکار اور اوباش لڑکی کے قتل میں مجھے ملوّث کر کے آپ نے میری نہیں میرے خاندان کی توہین کی ہے۔ مجھے اگر قتل کرنا ہوتا تو اُس برطانوی سکواڈرن لیڈر کو قتل کرتا جس نے میرے مُنہ پر گھونسہ مارا تھا۔ اُس لڑکی کو میں کیوں قتل کرتا جو طوائف سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی۔" — اُس کے لہجے میں غصّے کی جھلک آتی جا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا — "آپ نہیں جانتے کہ میں شہر اور چھاؤنی میں کاریں دیکھتا رہتا ہوں۔ رات کلب میں جو کاریں آتی ہیں انہیں غور سے دیکھتا ہوں۔ میں نے کاروں کے تعاقب کئے ہیں۔ میں نے اُن کاروں کے بھی پیچھے جیپ دوڑائی ہے جن کے نمبروں میں ۶۶ کے ہندسے تھے ہی نہیں۔ میں پاگل ہو رہا ہوں۔"

اُس کے بولنے کے انداز سے اُس کی ذہنی کیفیت کا پتہ چل رہا

تھا، اور یہ کیفیت ایسی تھی کہ میرے دل میں اُس کے خلاف جو شک تھا وہ کمزور ہو گیا۔ مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ مجھے اندر جانے کی جلدی تھی لیکن میں نے اُسی وقت بات کر دی تاکہ ذہن سے نکل نہ جائے۔ میں نے اُس سے پوچھا ـــ "قتل کے بعد اُس سکواڈرن لیڈر کے ساتھ تمہارا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا؟"

"دوبارہ اُس سے ملاقات ہوئی تھی" ـــ اُس نے کہا ـــ "قتل کی تیسری رات ایک ہوٹل میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے توقع یہ تھی کہ میرے ساتھ بات نہیں کرے گا لیکن مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آیا اور گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ کہنے لگا ـــ 'مجھے بہت خوشی ہے کہ ہماری انڈین آرمی میں تم جیسے دلیر افسر ہیں' ـــ میں نے اُس سے معافی مانگی کہ میں نے اُسے مارا تھا لیکن وہ اتنا زندہ دل اور کشادہ ظرف نکلا کہ ہنس پڑا اور بولا ـــ 'بھلا گھونسہ تو میں نے تمہیں مارا تھا۔ معافی مجھے مانگنی چاہیے' ـــ فوراً ہی کہنے لگا ـــ 'ایسے لڑائی جھگڑے میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ایک عیاش لڑکی کے لئے میں ایک اچھے افسر کی دوستی سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ آؤ بیٹھیں.....'

"اُس نے مجھے خاصی مہنگی شراب پلائی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ لڑکی کا ذکر ضرور کرے گا لیکن اُس نے کوئی بات نہ کی۔ آخر میں نے اُسے بتایا کہ لڑکی قتل ہو گئی ہے۔ اُس کا ردِّعمل ایسا تھا جیسے اُس کا دماغ چکرا رہا ہو۔ کچھ دیر تو میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا، پھر مجھ سے

پوچھا کہ وہ کس طرح قتل ہوئی ہے۔ میں نے اُسے تفصیل سے بتایا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قاتل یہی تو نہیں۔ مجھے ایسا شک نہیں ہوا۔ دو تین دن بعد اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ اُس تھانیدار کو گالیاں دینے لگا جس نے تفتیش کی تھی۔ یہ تھانیدار میرا بیان بھی لے چکا تھا اور میری نشاندہی پر اُس کے پاس بھی گیا تھا۔ اُس رات سکواڈرن لیڈر مجھ سے کچھ ناراض تھا کیونکہ میں نے اُس کی نشاندہی کی تھی لیکن اُس کی ناراضگی زیادہ دیر نہ رہی۔ میں اپنے طور پر راتوں کو کلب میں آنے والی کاروں کو دیکھتا رہا اور میں یہ بھی دیکھتا رہا ہوں کہ یہ سکواڈرن لیڈر کسی کار میں آتا ہے یا نہیں۔ مجھے کوئی مشکوک کار نظر نہیں آئی اور سکواڈرن لیڈر کو میں نے کسی کار والے کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

پارسی کا بیٹا

مجھے اندر جانے کی جلدی تھی۔ میں نے اسے کہا ـــ "آپ سے پوری بات بعد میں سنوں گا۔ آپ ذرا اندر چلیں۔ ہم نے پارسی کے بیٹے کو اپنے پاس بٹھایا ہے۔ اُسے دیکھ کر ہمیں اشارے سے بتا دینا کہ یہ آدمی کلب میں یا ایسی جگہوں پر پارٹیوں وغیرہ میں کبھی نظر آیا ہے یا نہیں۔ پھر آپ باہر آجانا۔"

وہ میرے ساتھ اندر گیا۔ اُس نے پارسی کے بیٹے سے ہاتھ ملایا۔

اُسے غور سے دیکھا، پھر اُس کے پیچھے ہو کر سر سے اشارہ کیا کہ نہیں۔
یہ آدمی کلب میں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ میجر معذرت کر کے باہر نکل گیا۔ ہم نے اس جوان پارسی سے بہت کچھ پوچھا۔ یہ بھی پوچھا کہ فوجی افسروں کے ساتھ اُس کی دوستی ہے یا نہیں۔

"ہم کاروباری لوگ ہیں" — اُس نے گھبراہٹ کے لہجے میں کہا۔ "دوستیوں میں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ ہماری دوستی صرف اُن کے ساتھ ہے جن سے ہمیں مال کے آرڈر اور پیسے ملتے ہیں۔"

"وہ آپ سے رشوت بھی لیتے ہوں گے" — میں نے کہا — "آپ کسی نہ کسی طرح انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے.... آپ بے تکلفی سے بتا دیں۔ ہم کسی اور سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔"

"ان لوگوں کو خوش تو رکھنا ہی پڑتا ہے" — اُس نے جواب دیا — "نقد رشوت تو کبھی نہیں دی۔ شراب کی بوتلیں مُفت دے دیتے ہیں یا کوئی قیمتی تحفہ پیش کر دیتے ہیں۔"

"ایسے آدمی اکثر گاڑی بھی مانگ لیتے ہیں" — میں نے ہندوستانی ذہنیت کے پیشِ نظر کہا — "اِدھر اُدھر جانے کے لئے ان میں سے کسی نے آپ سے کار بھی مانگی ہو گی۔"

یہ پیشِ نظر رکھیں کہ اُن دنوں کاروں کی یہ بھرمار نہیں تھی جو آج پاکستان میں نظر آتی ہے۔ کسی کسی کے پاس کار ہوتی تھی۔

"صرف ایک بار ایک افسر نے کار مانگی تھی" — اُس نے جواب دیا —

"لیکن میرے باپ نے انکار کر دیا تھا۔ ہم کسی کو کار نہیں دیتے۔"

"گزشتہ ایک مہینے میں آپ کی کار کتنی بار کلب میں گئی ہے"؟

"کئی بار گئی ہو گی" — اُس نے جواب دیا۔

"رات کو؟"

"رات کو کبھی نہیں گئی" — اُس نے کہا — "ہمارا کام دن کے وقت ہوتا ہے۔"

"ایئر فورس کے کسی افسر سے آپ کے تعلقات ہیں؟"

اُس نے دو ہندوستانی افسروں کا نام لیا اور کہا کہ وہ اپنے میس کے لئے شراب لینے آتے ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کوئی انگریز افسر اُس کا دوست ہے؟

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "دوست نہیں۔ گاہک کی حیثیت سے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔"

میکڈانلڈ نے قتل کی رات کی تاریخ بتا کر پوچھا کہ اُس کی کار کہاں تھی؟

اُس نے سوچ کر اور یاد کر کے جواب دیا — "آگرہ میں۔ اس تاریخ سے دو تین دن پہلے اور اتنے ہی دن بعد کار آگرہ میں رہی ہے۔ میں کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا۔"

یہ آدمی مجھے اتنا زندہ دل اور دلیر نہیں لگتا تھا کہ مقتولہ جیسی لڑکی کے ساتھ اس کے مراسم ہوں اور وہ کلبوں میں جا کر عیاشی کرے

اور قتل تک کا ارتکاب کرے۔ میری رائے یہ تھی کہ کاروبار کے سوا وہ کسی اور مسئلے پر بات نہیں کر سکتا اور نہ اُسے کسی اور چیز کے ساتھ دلچسپی ہے۔ میکڈانلڈ نے جب اپنے سوالوں کی بوچھاڑ کی تو اس پارسی جوان پر جیسے غشی طاری ہونے لگی ہو لیکن اُس کے جواب ایسے تھے جن سے کوئی شک نہیں ہوتا تھا۔ ہم اُسے گھبراہٹ کی انتہا میں مبتلا کر کے اٹھے۔ اُس کے باپ کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے مایوس لوٹے۔ ڈوگرا میجر باہر کھڑا تھا۔ اُس نے یقین کے لہجے میں کہا — "کار بھی غلط ہے اور یہ آدمی بھی۔ پارسی قتل ہو سکتا ہے قتل کر نہیں سکتا۔ پارسی کے اس بیٹے کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس میں وہ بات نہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔"

انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر نے راز دے دیا

میکڈانلڈ کے ذہن پر ابھی تک یہ سوار تھا کہ لڑکی اپنے گروہ کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے۔ واپس آتے اُس نے ڈوگرے میجر کی موجودگی میں اپنی رائے دُہرائی۔ ڈوگرے نے کہا — "چونکہ میں بھی مشتبہ ہوں اس لئے میرے دلائل آپ کو متاثر نہیں کر سکیں گے۔ آپ سمجھیں گے کہ میں آپ کو اپنے تعاقب سے جھٹک رہا ہوں۔ اگر آپ میرے متعلق اپنے ذہن ذرا سی دیر کے لئے صاف کر لیں تو اپنی رائے دوں ....

مسٹر میکڈانلڈ! آپ کا اندازہ بے بنیاد نہیں ہو سکتا۔ آپ نے جو راستہ سوچا ہے وہ میرے دماغ میں بھی آچکا ہے۔"

"لیکن ابھی ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ مقتولہ جاسوس تھی" — میں بول پڑا — "ہو سکتا ہے اسے علم ہی نہ ہو کہ اس کا باپ اور چچا جاسوس ہیں اور اس لڑکی کا اس گروہ کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ یہ تو ہمارے میجر دوست کو شک تھا کہ وہ جاسوس ہے۔ آپ کے پاس ثبوت تو کوئی نہیں" — میں نے میجر سے پوچھا — "آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس گروہ کی فرد تھی؟"

ڈوگرا مسکرایا اور بولا — "جاسوسی اور انٹیلی جنس کے سلسلے میں میں نے آپ کو کئی باتیں نہیں بتائیں اور بتاؤں گا بھی نہیں۔ میں آپ کے ساتھ قتل کی حد تک باتیں کر رہا ہوں۔ اس لڑکی کے متعلق میں نے جاسوسی کے شک کی جو تحقیقات کی ہے وہ میں آپ کو اپنی زبان سے نہیں بتا سکتا۔ اب جب کہ اس کا باپ اور چچا پکڑے گئے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی تفتیش کی لائن بھی بدل گئی ہے۔ آپ کو وہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں جو میں نے آپ سے چھپا رکھی ہیں لیکن میرے فرض اور ڈسپلن کا تقاضا یہ ہے کہ میں نہیں بتاؤں گا۔ البتہ یہ میرا فرض ہے کہ آپ کی راہنمائی کر دوں۔ آپ میرے محکمے کے چیف سے ملیں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں۔ آپ کو وائسرائے کی طرف سے تفتیش کا حکم ملا ہے۔ آپ اس حکم کے تحت میرے چیف سے کچھ راز لے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میری

طرح کا ایک اور میجر آپ کے حوالے کر دیا جاتے۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ کوئی مشتبہ نہیں ہے" — اُس نے جواب دیا — "وہ بھی انٹیلی جنس کا میجر ہے۔ مسلمان ہے۔ اور وہ بھی اس لڑکی کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا ہے .... لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جب آپ میرے چیف سے ملیں تو اس مسلمان میجر کا نام نہ لینا۔ مجھے امید ہے کہ میرا محکمہ آپ کے ساتھ تعاون کرے گا۔"

ہم نے اُسی وقت انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے دو مخبر اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور رپورٹیں دے رہے تھے لیکن ہمارا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ ڈوگرا میجر ہمیں اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا اور چیف کا دفتر دکھا کر غائب ہو گیا۔ ہم اندر گئے تو ایک انگریز بریگیڈیئر بیٹھا تھا۔ میکڈانلڈ نے میرا اور اپنا تعارف کرایا تو اُس نے مسکرا کر ہاتھ ملایا اور کہا — "آپ دونوں کے متعلق مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تفتیش کر رہے ہیں۔ کچھ کامیابی ہوئی؟"

"مجھے شک ہے کہ ہماری تفتیش کی لائن بدل گئی ہے" — میکڈانلڈ نے کہا — "معلوم ہوا ہے کہ مقتولہ کا باپ اور چچا جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" — بریگیڈیئر نے چونک کر پوچھا۔

"کسی کی گرفتاری کو آپ کتنا کچھ پوشیدہ رکھ سکتے ہیں" — میکڈانلڈ نے کہا — "ہم دونوں سپیشل سٹاف کے انسپکٹر ہیں۔ ہمارے مخبر آپ کے علاقے میں سرگرم ہیں۔"

"اگر ہمیں کسی ذریعے سے پتہ چل بھی گیا ہے تو آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے" — میں نے کہا — "ہم غیر ذمہ دار لوگ نہیں۔ ہو سکتا ہے اس گروہ کے باغی افراد ہمارے ہاتھ لگ جائیں۔"

میکڈانلڈ نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے بریگیڈیئر کو بتایا کہ ہمیں شک ہے کہ مقتولہ کو اس کے گروہ کے کسی آدمی نے اس لئے قتل کر دیا ہے کہ وہ گروہ کی نشاندہی کر دے گی۔ بے شک وہ پہلے قتل ہوئی ہے اور اس کا باپ بہت دن بعد گرفتار ہوا ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو بہت پہلے پتہ چل گیا ہو کہ ہماری انٹیلی جنس نے ان کی بو پا لی ہے۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"ہمیں مقتولہ کے متعلق معلومات درکار ہیں" — میکڈانلڈ نے کہا — "کیا آپ کے ہاں اس کے متعلق شک یا یقین موجود تھا کہ وہ جاسوس ہے یا جاسوس ہو سکتی ہے؟ .... یہ ممکن ہے کہ ہم اس گروہ کے کچھ افراد کو پکڑ لیں۔"

بریگیڈیئر نے پس و پیش کی۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو مجھے جاسوس سمجھ کر یہ بریگیڈیئر صاف جواب دے دیتا۔ اُس نے میکڈانلڈ کی بات

کا اثر لے لیا اور معلوم نہیں کس کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کر کے ہمیں کہا — "جس جگہ ہم اور آپ بیٹھے ہیں یہ اتنی خفیہ ہے جیسے زمین کی آخری تہہ کے بھی نیچے ہو۔ یہاں کے راز خدا کے سوا اور میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں آپ میں اس رازداری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُوپر سے اجازت لے لی ہے۔ میں آپ کو جو کچھ بتاؤں وہ آپ کے سینے میں دفن ہو جانا چاہئے۔ یہ نہ بھولیں کہ جرمنی کے جاسوس اس قدر ذہین ہیں کہ آپ کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیتے ہیں کہ آپ کے سینے میں کیا ہے۔"

وہ ہمیں ہدایات دے چکا تو میں نے اور میکڈانلڈ نے اُسے یقین دلایا کہ ہم رازداری میں محتاط رہیں گے۔ اُس نے جو تفصیل بتائی وہ مختصراً یُوں ہے — کرنل ڈاکٹر کے بھائی پر کچھ عرصے سے شک تھا۔ کلکتہ کی انٹیلی جنس اُس کے تعاقب میں لگی رہتی تھی۔ اُسے ایک مقام پر پتہ چل گیا تھا کہ وہ انٹیلی جنس کی نظر میں آ گیا ہے۔ اس کا علم انٹیلی جنس کو بھی ہو گیا تھا کہ وہ چوکس ہو گیا ہے لیکن اس وقت تک میرے افسر اس کی چند ایک رگیں ہاتھ میں لے چکے تھے۔ یہ رپورٹیں میرے پاس آتی رہیں۔ میں نے فوراً مقتولہ کی نگرانی شروع کرا دی۔ دو میجروں کو اُس کے پیچھے ڈال دیا۔

"آپ ان کے نام بتا سکتے ہیں؟" — میکڈانلڈ نے پوچھا — "ہمیں شاید ان سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔"

"ایک کو تو آپ جانتے ہیں" — اُس نے ڈوگرے میجر کا نام لے کر کہا — "دوسرے کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے وہ آپ کے سامنے نہیں آیا" — اُس نے ایک مسلمان میجر کا نام لیا۔ مجھے ڈوگرے کا نام تو یاد نہیں، مسلمان کا نام میرے سینے میں ہمیشہ محفوظ رہے گا لیکن میں یہ نام ظاہر نہیں کروں گا کیونکہ وہ اپنے خاندان سمیت پاکستان میں ہو گا۔

بریگیڈیئر نے ہمیں یہ اجازت بھی دے دی کہ ہم ان دونوں میجروں کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ اُس نے کہا — "میں انہیں کہہ دوں گا کہ جہاں آپ کو ان کی ضرورت پڑے وہ آپ کا ساتھ دیں۔ میں انہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ وہ کس حد تک آپ کو اپنے محکمے کی باتیں بتا سکتے ہیں" — اس بریگیڈیئر نے بھی اسی شک کا اظہار کیا جو میکڈانلڈ نے کیا تھا کہ لڑکی کو اس کے گروہ نے قتل کیا ہے۔ اس نے آخر میں کہا — "میں امید رکھوں گا کہ آپ میری بھی مدد کریں گے۔ میں اس پورے گروہ کو پکڑنا چاہتا ہوں۔"

مسلمانوں کی حویلی، کار اور ریوالور

یہ تو ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم اُس کی پوری پوری مدد کریں گے۔ اُس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے

تو میکڈانلڈ نے کہا کہ مسلمان میجر سے یہیں مل لیا جائے اور یہ ملاقات تعارف تک محدود رکھی جائے۔ پتہ کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ وہ باہر چلا گیا ہے، رات آٹھ بجے کے بعد ملے گا۔ ہم ملٹری پولیس کے ہیڈکوارٹر چلے گئے جہاں ہم نے دفتر بنا رکھا تھا۔ وہاں ایک تو ایک مخبر ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا اور ایک پیغام تھا جو انگریز وارنٹ آفیسر نے نوٹ کر لیا تھا۔ مخبر نے کوئی خاص رپورٹ نہیں دی۔ البتہ پیغام اہم تھا۔ ٹریفک پولیس نے فون پر ایک اور ایسی کار کی اطلاع دی تھی جس کے آخری دو ہندسے "۶۶" تھے۔ وارنٹ آفیسر نے کار کا پورا نمبر، مالک کا پورا ایڈریس وغیرہ نوٹ کر لیا تھا۔ یہ ایڈریس دلی کا نہیں تھا، ایک اور شہر کا تھا۔

میکڈانلڈ نے فوراً روانگی کے لئے کہا۔ جلدی جلدی کھانا کھا کر ہم نے اپنے دو مسلح کانسٹیبل جو ہمارے ساتھ رہتے تھے جیپ میں بٹھا لئے۔ ڈوگرے میجر کو کار کی شناخت کے لئے بلا لیا گیا تھا۔ انگریز وارنٹ آفیسر کی ضرورت نہیں تھی لیکن میکڈانلڈ نے اُسے سیر سپاٹے کے لئے ساتھ لے لیا۔ میں ذہنی طور پر مایوس اور ناکام لوٹنے کے لئے تیار تھا لیکن تفتیش میں کسی معمولی سے اشارے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جب دلی سے اُس شہر کی طرف نکلے تو مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ میں نے میکڈانلڈ سے کہا ـــ "آپ کو یاد ہوگا کہ ہم اس سڑک پر پہلے بھی آ چکے ہیں۔ اِن (ڈوگرے) کے بیان کے مطابق

قاتل کی کار اسی سڑک پر اور اسی سمت گئی تھی" ـــ بہرحال یہ ایک خوش فہمی تھی۔

ہم کار والے شہر میں پہنچے اور بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ یہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ اب شاید بہت بڑا ہو گیا ہو۔ اُس وقت یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ ہم جس مکان کے سامنے رُکے وہ کوئی کوٹھی یا بنگلہ نہیں تھا، حویلی تھی اور یہ حویلی امیر لوگوں کی معلوم ہوتی تھی۔ باہر کار کھڑی تھی۔ ڈوگرے میجر نے پہلی نظر میں ہی کہا ـــ "اگر میرا دماغ خراب نہیں ہو گیا تو یہی کار تھی .... نمبر پڑھو ۳۳۶۶"

ڈوگرے میجر نے اپنے پہلے بیان میں کار کے نمبر کے پہلے دو ہندسے ذہن سے اُتار دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ ۲۳ تھے یا ۳۲ یا ۸۳۔ ملٹری پولیس کی جیپ کو، تین انگریزوں اور دو رائفل بردار کانسٹیبلوں کو دیکھ کر لوگ اکٹھے ہو گئے جنہیں کانسٹیبلوں نے بھگا دیا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک نوکر باہر آیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ کسی بڑے آدمی کو باہر بھیجو۔

دو آدمی اکٹھے باہر آئے۔ ایک کی عمر تیس سال سے کم تھی اور دوسرا تیس پینتیس سال کے درمیان لگتا تھا۔ ان کے لباس اور ڈیل ڈول سے لگتا تھا کہ بڑے زمیندار یا جاگیردار ہیں۔ یہ مسلمان تھے اور میواتی۔ انہیں میو بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا ـــ "یہ کار کس کی ہے؟"

"ہماری" — ایک نے جواب دیا۔

انہوں نے ہم سے اتنا بھی نہ کہا کہ آؤ اندر بیٹھو۔ بڑے نے پوچھا — "کیوں؟ یہ چوری کی تو نہیں" — اُس کے لہجے میں رُعب سا تھا۔ میں نے آگے ہو کر اُسے دھیمی آواز میں کہا — "میں نے ابھی کوئی بات نہیں کی اور تم نے ایک بات فالتو کہہ دی ہے۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں، یہ انگسپنہ بھی پولیس انسپکٹر ہے، یہ فوج کا میجر ہے اور اس کے ساتھ ملٹری پولیس کا انگریز وارنٹ افسر ہے۔ تم میں اتنی بھی تمیز نہیں کہ ہمیں اندر بیٹھنے کو کہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ہم یہاں لوگوں کے سامنے وہ کام شروع کر دیں گے جس کے لئے آئے ہیں۔"

انہوں نے ہمیں اندر چلنے کو کہا۔ ہم سب اندر گئے اور ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ میرے دماغ میں ایک بات آگئی تھی۔ ڈوگرہ میجر بھی میرے پیچھے آگیا۔ میں کار کے پچھلے حصے کو دیکھنے لگا۔ ڈوگرے میجر نے تعاقب کے دوران اس کار پر تین گولیاں چلائی تھیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گولیاں کہیں لگی تھیں یا نہیں۔ مجھے بھی کسی گولی کا نشان نظر نہیں آیا۔ میں نے اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ڈوگرا میجر پچھلے بائیں پہیے کے قریب بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا — "میرا نشانہ اتنا خراب تو نہیں تھا لیکن میں نے فائر بائیں ہاتھ سے اور چلتی گاڑی سے کیا تھا۔"

"یہ دیکھنا مسٹر ملک!" — ڈوگرے نے مڈگارڈ کے کنارے پر

انگلی رکھ کر کہا۔

میں نے دیکھا۔ کنارہ اتنا سا پچکا ہوا تھا جتنی ریوالور کی گولی ہوتی ہے۔ اس سے ذرا اُوپر مجھے ایک لکیر نظر آئی۔ میں نے ٹائر کو دیکھنا شروع کیا۔ ٹائر گھسا ہوا نہیں تھا۔ ایک جگہ ٹائر کے اُوپر یعنی اس حصے میں جو سڑک پہ چلتا ہے، ایک گہری لکیر تھی جیسے کسی نے چھوٹی گول ریتی سے رگڑا ہو۔ یہ گولی کا نشان ہو سکتا تھا۔ میں نے میجر سے کہا کہ کار کو ذرا پیچھے کو دھکیلو۔ ہم دونوں نے ذرا سا دھکا لگایا اور ٹائر کے اس نشان کو اس پچکے ہوئے نشان کی لائن میں لے آئے جو مڈگارڈ پر تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر پیچھے سے دیکھا۔ وہاں سے مجھے مڈگارڈ کا وہ حصہ دکھائی دیا جو ٹائر کے سامنے ہوتا ہے۔ وہاں کیچڑ جما ہوا تھا اور ایک جگہ مجھے چمکتی ہوئی ایک چیز نظر آئی۔ میں نے ہاتھ اندر کیا تو یہ [illegible]ٹ میں پیوست تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کامیابی کی خوشی سے [illegible] کی طرح پھٹ جاؤں گا۔

میں دوڑتا اندر گیا اور سب سے کہا کہ باہر آؤ۔ سب باہر آئے تو میں نے کار کے مالکوں سے کہا کہ کوئی ایسی چیز لاؤ جس سے مڈگارڈ کے اندر کا کیچڑ اُتارا جا سکے۔ ان میں سے ایک وہاں سے چلا تو میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"تم یہیں رہو" — میں نے اُسے کہا — "نوکر کو آواز دو۔"

رشوت یا موت

نوکر کھرپا اٹھا لایا۔ میں ...نے آہستہ آہستہ مڈگارڈ کے اندر سے اس جگہ سے کیچڑ ہٹانا شروع کیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ وہ چیز صاف نظر آنے لگی۔ میں نے میکڈانلڈ سے آگے ہو کر دیکھنے کو کہا۔ اس نے دیکھا۔ اس چیز کو چھوا۔ وہ اٹھا تو اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے ٹائر کا نشان دکھایا۔ اس نے ڈوگرے میجر کی طرف دیکھ کر کہا ــ ”آپ کا نشانہ برا نہیں۔ ٹائر کو آپ نے مس نہیں کیا۔ ایک انچ کا فرق رہ گیا تھا۔“

میں نے کار کے مالکوں سے کہا ــ ”تمہیں معلوم نہیں ہوا تھا کہ جیب سے تمہاری اس کار پر ریوالور کی گولیاں فائر ہوئی ہیں؟“

دونوں کے منہ کھل گئے اور رنگ اڑ گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”آگے آؤ تمہیں دکھاؤں“ ــ میں نے دونوں کو آگے کر کے مڈگارڈ کے اوپر والے کنارے کا ڈینٹ دکھایا، پھر ٹائر کی لکیر دکھاتی اور کہا ــ ”ایک گولی یہاں لگی ہے۔ اسی گولی نے آگے جا کر ٹائر کو اوپر سے کاٹا اور یہ گولی مڈگارڈ میں جا کر پھنس گئی۔ گولی کی رفتار ٹکراؤ اور ربڑ سے کم ہو گئی تھی اس لئے آگے جا کر مڈگارڈ میں اتر گئی۔ پار نہ ہو سکی۔

یہ دو گولیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک اوپر مڈگارڈ کے کنارے پر لگی۔ دوسری ٹائر کے اوپر کے حصے کو کاٹتی آگے مڈگارڈ میں پھنس گئی۔“

وہ پھر بھی چپ چاپ رہے۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا ــ ”تم دونوں تھے؟“

ان کی تو جیسے زبانیں اکڑ گئی تھیں۔ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں نے ایک معزز سے آدمی کو آگے بلا کر مڈگارڈ میں پھنسا ہوا گولی کا سکہ دکھایا اور اسے کہا کہ اسے کار کی برآمدگی کی گواہی دینی ہو گی۔ دوسرا گواہ ڈوگرے میجر کو بنا لیا۔ اس معزز آدمی کو اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔

”تمہارا ریوالور کہاں ہے؟“ ــ میں نے کار والوں سے پوچھا۔

”ہمارے پاس ریوالور نہیں ہے“ ــ چھوٹے نے جواب دیا۔

”میں مکان کی تلاشی لے رہا ہوں“ ــ میں نے کہا ــ ”ریوالور برآمد ہو جائے گا۔ خود ہی نکال دو۔“

”اندر چلو“ ــ ایک نے کہا ــ ”دوسرے اندر نہ آئیں۔“

”سب اندر چلیں گے“ ــ میں نے کہا۔

”ہم صرف آپ کے ساتھ بات کرنا چاہتے ہیں“ ــ بڑے نے کہا ــ ”ذرا سی دیر کے لئے چلیں۔“

میں میکڈانلڈ سے معذرت کر کے ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میرے پاس ریوالور تھا جو میں نے پتلون کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے سلنڈر میں چھ گولیاں تھیں۔ میں تیار ہو کر اندر گیا کیونکہ یہ میو قوم کے مسلمان

تھے۔ ان کے متعلق میں آپ کو مختصراً کچھ بتا دوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ قوم جو اس ایک ہی علاقے میں رہتی تھی جنگجو، خونخوار اور غیر معمولی طور پہ دلیر قوم تھی۔ یہ لوگ احمقانہ حد تک دلیر تھے اور پکے مسلمان۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا تو انہیں صرف میئو قوم کی طرف سے خطرہ تھا۔ ہندوستانی حکومت نے آزادی ملتے ہی، بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آزادی سے چند دن پہلے انگریزوں سے ساز باز کر کے ہندوستانیوں نے میواتی علاقے میں ٹینک اور فوج بھیجی اور ان مسلمانوں سے کہا کہ وہ سب دلی چلے چلیں اور وہاں سے انہیں پاکستان بھیجا جائے گا۔ انہیں دھوکہ بھی دیا گیا اور فوج کی بے پناہ طاقت بھی استعمال کی گئی۔ بعض جگہوں پر میواتیوں نے ہندوؤں کی نیت سمجھ کر فوج کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے مگر زیادہ تر میواتی اس دھوکے میں آ گئے کہ ٹینکوں کے ساتھ فوج ان کی حفاظت کے لئے آئی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ دلی چلے گئے۔ وہاں انہیں لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیانی میدان میں جمع کر کے ان کے ارد گرد ٹینک اور بکتربند گاڑیاں کھڑی کر دی گئیں۔ اس فریب کاری اور اوچھی حرکت سے مسلمانوں کی اس قوت کو بے بس کر دیا گیا جو ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ انہیں کئی روز بھوکا پیاسا رکھ کر تھوڑی تھوڑی تعداد میں پاکستان بھیجا گیا تھا۔

میں نے اینگلو انڈین لڑکی کے قاتل پکڑ لئے تھے۔ ابھی یہ معلوم کرنا

باقی تھا کہ انہوں نے اسے قتل کیوں کیا۔ یہ کرائے کے قاتل نہیں ہو سکتے تھے۔ جاسوسی کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ البتہ میں اس پر بالکل حیران نہیں تھا کہ انہوں نے قتل کیا ہے۔ میئو کے لئے قتل ایک معمولی واردات تھی۔ انہوں نے جب مجھے اکیلے اندر چلنے کو کہا تو میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اندر لے جا کر یہ مجھے بھی قتل یا غائب کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں ان کی دلیری سے واقف تھا جو حماقت کی حد تک بھی پہنچ جایا کرتی تھی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی پتلون کی اس جیب میں ڈال لیا جس میں ریوالور تھا۔ ریوالور کو پکڑ لیا۔

اندر جاتے ہی بڑے بھائی نے کہا — "جتنی رقم مانگتے ہو ابھی لے لو اور سب کو یہاں سے لے جاؤ" — میں اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کہا — "اگر تین پانچ کی تو باہر والوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

کمرے میں ایک پلنگ پڑا تھا جس پر نہایت اچھا پلنگ پوش تھا۔ دونوں طرف گول تکیے تھے۔ چھوٹے بھائی نے ایک تکیہ ہٹایا، پھر پلنگ پوش ہٹایا۔ مجھے وہاں ریوالور پڑا نظر آیا۔ یہ ".۳۸" تھا۔ اس نے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ایک لمحے میں جیب سے ریوالور نکالا اور اس ریوالور پہ ایک گولی چلائی جس کی طرف اس کا ہاتھ بڑھ رہا تھا۔ گولی ریوالور کو نہیں لگی، پلنگ میں لگی۔ وہ پیچھے ہٹا۔ میں نے دوسری گولی اس کے پاؤں میں فائر کی۔ میری پارٹی جو باہر کھڑی تھی، گولیوں کی

ہی رفتار سے اندر آئی۔ سب کے ریوالور ہاتھوں میں تھے۔ میری دو گولیوں نے دو ملزموں کو بے بس کر دیا تھا۔ میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ دونوں کو ہتھکڑیاں لگا لیں۔ ہتھکڑیاں ساتھ رہتی تھیں۔

میں نے میکڈانلڈ کو مبارک باد دی۔ کار اور ریوالور کی برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا۔ اس پر دو مشیروں کے دستخط کرائے۔ ایک ڈوگرا میجر تھا اور دوسرا وہ معزز آدمی جسے میں نے منتخب کیا تھا۔ ڈوگرے میجر نے کہا کہ یہ لوگ جاسوسوں کے گروہ کے ہو سکتے ہیں اس لئے مکان کو سیل کرنا یا فوری طور پر اس کی تلاشی لینی ضروری ہے۔ میں نے میجر اور وارنٹ آفیسر کو مکان کے اندر کھڑا کر کے گھر کے تمام افراد کو ایک جگہ جمع کر لیا۔ میکڈانلڈ لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہاں اس کی زبان سمجھنے اور بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہو رہا تھا کہ میں پردہ نشین مستورات کو پریشان کر رہا تھا۔

میں خود ہی پولیس سٹیشن چلا گیا۔ وہاں سے دلی انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر کو ٹیلیفون پر اطلاع دی۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کو بھی رپورٹ دی۔ پولیس سٹیشن نے مجھے چند ایک کانسٹیبل دے دیئے۔ انہیں اپنے ساتھ لا کر میں نے مکان کے اندر اور باہر کھڑا کر دیا۔ وہاں کی پولیس نے میری یہ مدد بھی کی کہ مجسٹریٹ کو بلا دیا۔ یہ کیس اس لئے سنگین ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق جاسوسی کے ساتھ معلوم ہوتا تھا۔

دو گھنٹوں کے اندر اندر دلی سے ملٹری پولیس کی تھوڑی سی نفری

آ گئی۔ بریگیڈیئر بھی ساتھ تھا۔ مجسٹریٹ کی موجودگی میں مکان کی تلاشی لی گئی۔ ملٹری پولیس نے دیواروں کی اینٹیں نہیں اکھاڑیں باقی کوئی کسر نہ رہنے دی۔ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ میں نے دونوں ملزموں سے جو سگے بھائی تھے پوچھا کہ وہ دونوں ملزم ہیں یا دونوں میں ایک یا زیادہ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے تسلیم کیا کہ وہ دونوں ہیں۔

مسلمان میجر اور جاسوس لڑکی

انہیں دلی لے گئے۔ ہم انہیں اپنی حوالات میں لے جانا چاہتے تھے لیکن بریگیڈیئر انہیں ملٹری پولیس کی حوالات میں رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ ان کا تعلق جاسوسوں کے گروہ کے ساتھ ہو گا۔ مجھے بھی شک تھا کیونکہ ان کا اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ اور کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ہم نے انہیں ملٹری پولیس کی کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا۔ کار ہم ساتھ لے آئے تھے۔ ہم آرام کے لئے چلے گئے۔ ارادہ تھا کہ رات بہت دیر بعد تفتیش کریں گے۔

ہم بمشکل لیٹے ہی تھے کہ ڈوگرا میجر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر آ گیا اور تعارف کرایا کہ یہ انٹیلی جنس کا وہ مسلمان میجر ہے جس کا اُس نے ذکر کیا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "مقتولہ کو جتنا یہ جانتا ہے اتنا میں نہیں جانتا۔"

"اور مقتولہ مجھے تباہ و برباد کر گئی ہے" مسلمان میجر نے اُداس اور پریشان لہجے میں کہا۔ میں اور میکڈانلڈ ہمہ تن گوش ہوئے تو اُس نے کہا "آپ نے جن دو بھائیوں کو گرفتار کیا ہے وہ میری بیوی کے سگے بھائی ہیں۔ میں انہیں کوارٹر گارڈ میں مل آیا ہوں اور انہیں کہا ہے کہ وہ اقبالِ جرم کر لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جاسوسی کے ساتھ ان کا دُور پار کا بھی تعلق نہیں ہے۔ پوری کہانی وہی آپ کو سنائیں گے۔ میں صرف پس منظر سنا دیتا ہوں۔ میں اسی جگہ کا رہنے والا ہوں جہاں سے آپ نے انہیں گرفتار کیا ہے۔ میں بھی میتو ہوں۔ ہماری قوم میں تعلیم کی کمی ہے اور نئے دور کی تہذیب کو قبول نہیں کرتی تعلیم معدودے چند گھرانوں میں آئی ہے جن میں میرا گھرانہ بھی ہے۔ میں نے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے....

"میری شادی اس گھرانے میں ہوئی۔ میرے سُسرال کے پاس جاگیر اور دولت ہے، تعلیم اور نئی روشنی نہیں۔ میں نے خوشی سے شادی کر لی۔ مجھے پڑھی لکھی اور ایڈوانس لڑکی کی خواہش نہیں تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو مجھے ترقی مل گئی اور مجھے انٹیلی جنس کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے جنگ نے ملک کو جاسوسوں سے بھر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ گھر والوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور گھر کب آئیں گے۔ میری بیوی کو میرا یہ معمول پسند نہیں تھا۔ میں نے اسے سمجھا بجھا لیا

کہ میری ڈیوٹی ایسی ہے جس میں وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ سمجھ گئی۔ پھر بھی کبھی کبھی پریشان ہو جاتی تھی....

"ایک روز کہنے لگی کہ آپ کی توجہ کہیں اور چلی گئی ہے۔ آپ مجھ سے اُکتا گئے ہیں۔ میں نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اس کا شک رفع نہ کر سکا۔ میں نے اسے کہا کہ تم پردہ ہٹا دو اور جہاں میں جاتا ہوں وہاں میرے ساتھ چلا کرو۔ وہ پردے سے نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ میں اکثر اوقات اتنا زیادہ تھکا ہُوا گھر جاتا تھا کہ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بیوی اسے میری بے رُخی سمجھتی تھی۔ اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ اتنے بڑے افسر ہیں، آپ کو باہر بڑی بڑی خوبصورت اور آزاد خیال لڑکیاں مل جاتی ہوں گی۔ میں ان کے مقابلے میں کیا ہوں....

"اِدھر کام زیادہ، ساتھ تھکن اُدھر گھر میں شکوے اور شکائتیں۔ کہیں بھی سکون نہ رہا۔ میں نے ایک روز بیوی کو ڈانٹ دیا۔ اس سے گھر میں آئے دن جھگڑا اور جھک جھک ہونے لگی۔ ایک بار بیوی کی ماں آئی تو اُس نے بھی مجھے نصیحت کی کہ میں وقت پر گھر آیا کروں اور فساد نہ کیا کروں۔ میں نے اُسے سمجھایا مگر وہ نہ سمجھی۔ اس کے ساتھ بھی ترش کلامی ہُوئی۔ اُس کے بیٹے آئے تو میری بیوی نے ان سے شکایت کی۔ آپ ہماری قوم کو نہیں جانتے۔ ہر بات دھونس اور دبدبے سے کرتے ہیں۔ ان بھائیوں نے میرے ساتھ بدتمیزی سے بات کی۔

مجھے غصہ آ گیا۔ میں بھی میواتی ہوں۔ میں نے اپنے والدین سے جا کر
کہا کہ ان لوگوں سے کہو کہ میرے ساتھ ان کا یہ سلوک جاری رہا تو میں بیوی
کو طلاق دے دوں گا۔ دھمکی میرے سسرال پہنچی تو وہاں سے جواب ملا
کہ طلاق دو گے تو قتل ہو جاؤ گے.....

"میں جانتا تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ یہ لوگ قتل کر کے دکھا
دیں گے لیکن میرا ارادہ طلاق دینے کا تھا ہی نہیں۔ مجھے اپنی بیوی سے
ہمیشہ محبت رہی ہے اور رہے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان طلاق
کی نسبت مر جانا پسند کرتے ہیں۔ ہم لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو
سسرال کے جہنم میں ڈالے رکھتے ہیں طلاق قبول نہیں کرتے.....
اتنے میں مجھے اس اینگلو انڈین لڑکی کے متعلق اپنے چیف سے حکم
ملا کہ اسے زیرِ نگرانی رکھو اور اس کے ساتھ دوستی لگانے کی کوشش
کرو۔ میرا یہ دوست (ڈوگرا میجر) پہلے ہی اسے دوست بنا چکا تھا۔
لیکن کسی اور مقصد کے لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لڑکی جاسوس ہے۔
اس نے بھی اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ اس کی خاطر تواضع کے لیے ہمیں
منہ مانگے پیسے ملتے تھے.....

"میں اسے اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں میں بھی لے گیا اور اسے شملہ
تک کی سیر کے لیے لے گیا۔ اس کے ساتھ جاسوسی کی باتیں بھی کیں۔
تمام حربے استعمال کیے لیکن اس نے اپنا بھید نہ دیا۔ ایک روز دلی
میں میری بیوی کے بھائیوں نے اسے میرے ساتھ دیکھ لیا۔ پھر

انہوں نے دلی میں کسی ہوٹل میں رہ کر میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ایک
روز انہوں نے مجھے گھر آ کر دھمکی دی کہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ میں
کس کی خاطر ان کی بہن کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں سمجھانے
کی کوشش کی لیکن میری ڈیوٹی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ یہ میں جانتا تھا
کہ یہ لڑکی جو جرنیلوں کو بھی انگلیوں پہ نچاتی ہے، میرے ساتھ کیوں
بے تکلف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میں انٹیلی جنس کا افسر ہوں۔ وہ مجھے
اندھا کیے رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے اس دوست (ڈوگرے میجر)
سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا یہ حربہ ناکام ہو گیا ہے۔ اب کوئی اور طریقہ استعمال
کریں گے مگر وہ قتل ہو گئی.....

"اس (ڈوگرے میجر) نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی جیپ میں قتل
ہوئی ہے اور گولی ایک سیاہ کار سے چلی تھی تو میں سمجھ گیا کہ قاتل کون
ہیں۔ میں نے اپنے دوست سے بھی بات نہ کی۔ اس کے بعد مجھے اپنی
بیوی کے بھائی نظر نہ آئے۔ میں نے اپنی بیوی سے بھی قتل کے متعلق
بات نہ کی مگر میرا دل ہر لمحہ پریشان رہا۔ مجھے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ
یہ دونوں پکڑے جائیں گے۔ تھانیدار تفتیش کرنے لگا تو میں نے
اس پر نظر رکھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ تفتیش نہیں کر سکے گا۔ مجھے خوشی
ہوئی مگر آپ نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ میں نے آپ کو قتل کا باعث
سنا دیا ہے۔ ان دونوں کا جاسوسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں
نے انہیں کوارٹر گارڈ میں کہہ دیا ہے کہ ان کے خلاف جاسوسی کا الزام

بھی ہے اس لئے وہ قتل کا اعتراف کر لیں۔ وہ تو انہیں کرنا ہی پڑے گا۔ معلوم ہُوا ہے کہ انہوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تھی۔"

بہن کے سہاگ کے لئے

انہوں نے اقبالِ جُرم کر لیا۔ بالکل یہی کہانی سنائی جو اُن کا بہنوئی میجر سُنا گیا تھا۔ وہ دراصل اُس کا پیچھا کرتے رہے، اور وہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ میجر اس اینگلو انڈین لڑکی کی خاطر اُن کی بہن کو طلاق دینا چاہتا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر میجر نے اُن کی بہن کو طلاق دی تو اُسے بھی اور اینگلو انڈین لڑکی کو بھی قتل کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس لڑکی کو راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ طلاق تک نوبت ہی نہ آئے۔ انہوں نے لڑکی کا کمرہ دیکھ لیا تھا۔ قتل کی رات مقتولہ کمرے سے نکلی اور ایک انگریز فوجی افسر کے ساتھ جیپ میں چلی گئی۔ دونوں بھائی کار میں تھے۔ انہوں نے تعاقب کیا۔ جیپ کلب میں چلی گئی۔ دونوں بھائی کلب کے باہر کھڑے رہے۔ انہوں نے بیرے سے پوچھا کہ اندر جو کچھ ہو رہا ہے کس وقت ختم ہوگا۔

انہیں آدھی رات تک انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے سکواڈرن لیڈر اور ڈوگرے میجر کی لڑائی بھی دیکھی۔ لڑکی کو ڈوگرے کے ساتھ جیپ میں جاتے دیکھا۔ انہوں نے کار چلائی اور جیپ کے پیچھے گئے۔ کار بڑا

بھائی چلا رہا تھا۔ بائیں طرف چھوٹا بھائی بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جیپ ویران علاقے میں پہنچی تو کار تیز ہوئی۔ جیپ کے دائیں پہلو کے ساتھ ہوئی۔ بڑے بھائی نے بتیاں بُجھا دیں۔ چھوٹے بھائی نے ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑا۔ لڑکی کی پیٹھ سامنے تھی۔ فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ قاتل نے ریوالور قریب کر کے دو گولیاں فائر کر دیں۔ اُسے لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ بڑے بھائی نے رفتار تیز کر دی۔ جیپ نے کچھ دُور تک تعاقب کیا۔ انہوں نے جیپ سے ریوالور کا فائر سُنا تھا۔

وہ اپنے شہر پہنچ گئے۔ صبح کے وقت انہوں نے کار کے پیچھے اور بائیں دیکھا۔ انہیں کہیں بھی گولی کا نشان نظر نہ آیا۔ وہ مڈگارڈ پر اتنے باریک نشان کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ڈوگرے میجر کے ریوالور کی گولی اپنی کار میں لئے پھر رہے ہیں۔ اتنے زیادہ دن گزر گئے تو وہ بہت خوش ہوتے کہ اُن کا سراغ ملا ہے نہ ملے گا۔ وہ اب بھی خوش تھے۔ کہتے تھے کہ پھانسی کا کوئی افسوس نہیں، ہم نے بہن کو مطمئن کر دیا ہے۔ اُس کی خوشی اسی میں تھی کہ جو اُس کا سہاگ اُجاڑ رہی ہے وہ زندہ نہ رہے۔

انٹیلی جنس اور ملٹری پولیس نے اپنی تفتیش کی۔ ان بھائیوں کے خلاف جاسوسی کا جُرم ثابت نہ ہو سکا۔ قتل میں انہیں عمر قید ملی۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ اُن کے بہنوئی میجر نے اپنے خرچ پر دِلّی کا ایک بڑا ہی قابل ہندو وکیل کیا تھا جس نے شک کا فائدہ دلا کر دونوں کو بری کرا لیا۔